فکر و فن

واحد بُزدار

فکر و فن

واحد بُزدار

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

نام کتاب	:	فکر وفن
محقق	:	واحد بُزدار
ناشر	:	بلوچی اکیڈمی
کمپیوٹر کمپوزر	:	الیاس بلوچ
ٹائیٹل	:	بلوچی پبلیشرز کوئٹہ
پرینٹرز	:	المخزن پرنٹرز کراچی
سال اشاعت	:	2006
تعداد	:	500
قیمت	:	250

بہ تعاون: اکادمی ادبیات پاکستان

فہرست

۱ حرف چند 1

۲ میر گل خان نصیر 2

۳۔ آزات جمالدینی 49

۴۔ سید ظہور شاہ ہاشمی 71

۵۔ مراد ساحر 78

۶۔ عطا شاد 91

۷۔ اکبر بارکزئی 109

۸۔ ملک طوقی 124

۹۔ بشیر بیدار 130

۱۰۔ اللہ بشک بزدار 137

۱۱۔ مبارک قاضی 148

۱۲۔ کتابیات 160

حرفِ چند

''فکر وفن'' جدید بلوچی شاعری کے نمائندہ شعرا کے افکار وخیالات کا احاطہ کرتی ہے۔ مجھے قطعاً یہ دعوٰی نہیں ہے کہ میں مکمل طور پر ان کے احساسات کو سمجھنے اور انہیں تنقیدی دھار پر پرکھنے میں کامیاب رہا ہوں۔ لیکن یہاں، یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ مجموعی طور پر جدید بلوچی شاعری سچائی، دیانت اور خون جگر کی شاعری ہے۔ بدصورتی اور بدوضعی کے خلاف احتجاج، انکار اور مزاحمت اس کا مرکزی موضوع ہے۔ اِس کے یہاں دائمی امن، عدل، جاودانیت، انسانی تقدیر اور اِس کے مستقبل کا سوال قومیتوں کے باہمی احترام واشتراک، عالمی اجتماعیت، عالمی امن اور عالمی احساس میں پنہاں ہے۔ اور یہی انسانی مستقبل کا حقائق نامہ بھی ہے۔

واحد بُزدار

میر گل خان نصیر

میر گل خان نصیر اپنے عہد کے ایک ایسے عظیم شخصیت ہیں کہ جن کی تمام تر زندگی مسلسل اور انتھک جدوجہد سے عبارت ہے۔ وہ ایک بلند پایہ دانشور، مورخ، محقق، ادیب اور سیاستکار ہی نہیں بلکہ اپنے دور کے ایک قد آور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید بلوچی ادب کی تشکیل وارتقاء میں اپنی کاوشوں کے اعتبار سے منفرد مقام ومرتبت کے حامل ہیں۔

میر نصیر کی شاعری اور ان کے فن کے متعلق اکثر و بیشتر یہ اعتراض بڑی شدت سے کیا جاتا رہا ہے کہ ان کی شاعری انسانی قدروں کی حمایت میں ایک ڈھنڈورا اور نعرہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہاں تک کہا گیا کہ وہ شاعری کے فیکٹری میں اشعار کے قالب میں تیر وتلوار، توپ و بم اور اسلحہ بارود بناتے ہیں۔ یہ سچ تو ہے مگر یہ آدھا سچ ہے کہ جس کے بارے میں میر نصیر خود رقم طراز ہیں کہ

"میری شاعری میں براہ راست شمشیر وسناں کا ذکر میرے بعض احباب کو پسند نہیں

آتا۔لیکن میں اپنے جذبات کی یورش سے اس قدر محو ہو جاتا ہوں کہ ان احباب کی ہدایات پر عمل نہیں کر سکتا۔طبیعت میں جب روانی آتی ہے اور اشعار کا سیلاب امڈ آتا ہے تو اس میں تیر و تفنگ کی صدا گونجنے لگتی ہے۔تب میں اسے روک نہیں سکتا۔"(۱)

لیکن میر نصیر کی شاعری پر اس طرح کی تنقید کرنے سے پہلے ہمیں اس عہد کی تمام تر سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی اور نفسیاتی رویوں اور اس صورتحال کا ادارک کرنا ہوگا کہ جس کے گرد میر نصیر کی شاعری اور ان کے فکر و فن کا تانا بانا بنتا ہوا نظر آتا ہے۔میر نصیر اس صورتحال کے متعلق لکھتے ہیں۔"جبکہ اپنی مادر وطن بلوچستان اور اپنی قوم بلوچ سے مجھے دلی وابستگی اور عشق ہے۔وہ کون ایسا بدنصیب عاشق ہوگا کہ اپنی محبوبہ کو تباہ حال و خانماں برباد ہوتا دیکھے اور اس کے تن بدن میں آگ نہ لگے۔دل میں درد کی ٹیسیں نہ اٹھیں اور آنکھوں سے سیلاب اشک رواں نہ ہو۔جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔اپنی مادر وطن اور اپنی قوم کو استعماریوں کے آہنی استحصالی پنجوں میں جکڑا ہوا دیکھا ہے۔"(۲)

میر نصیر کا عہد جہاں ایک طرف شکست و ریخت، انتشار و خلفشار، مایوسی و بے چینی، انفرادیت و اجنبیت، فرار و گریز اور بے حسی و بے اعتنائی جیسے حالات و واقعات سے عبارت ہے تو دوسری طرف انگریزی استعماریت کی غلامی اور ان کے جبر و استحصال کے قائم اداروں اور سرداری نظام کے جابرانہ چیرہ دستیوں کے خلاف آزادی وطن، غلامی سے نجات اور مادرِ وطن کی بقاء کے جذبہ سے سرشار قومی تحریکوں کا وہ نقطہء آغاز بھی ہے کہ جس کے نتیجے کے طور پر میر نصیر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا

تھا۔ ''تقسیم ہند سے پہلے نصیر کی شاعری آزادی کی جنگ سے تعبیر ہے اور پھر آزادی ملی۔ مگر نصیر کے وطن کے لوگ آزاد نہیں ہوئے۔ آقاؤں کے نام اور شکلیں بدل گئیں۔ استحصال کا انداز بدل گیا اور پاکستان کے دوسرے حصوں کے عوام کی طرح نصیر کے مادر وطن بلوچستان کے عوام کو نہ استحصال سے آزادی ملی، نہ سامراج سے چھٹکارا ملا۔ نہ افلاس سے نجات ملی، نہ تکلیف کی زندگی کے روز وشب کا انجام ہوا۔ اور نہ ہی بلوچستان کے عوام کی زبان اور ادب وفنون کو ترقی نصیب ہوئی''۔ (۳)

ایسے گھٹن و نامساعد حالات اور بے یقینی و بے حسی کے اس کرب و بلا میں میر نصیر کے لب و لہجے کا تلخ اور درشت ہونا ایک فطری عمل تھا۔ اور صرف یہ نہ تھا بلکہ میر نصیر کو اپنے اس تلخ لہجے کا بخوبی احساس بھی تھا وہ اپنی ایک نظم ''مہر نزاناں'' میں اس تلخ نوائی کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہرگز نہیں کہ وہ محبت کی زبان نہیں سمجھتے مگر کیا کیا جائے کہ جبر کی سختیوں اور تلخیوں کی اس فضا میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

؎ کون کہتا ہے کہ بیگانہ مہر و وفا ہوں میں
جمال رنگ و روشنی سے ناآشنا ہوں میں
مگر اس دل بے اماں کو کیسے سمجھائے کوئی
پیٹ کی آگ کو کیونکر بجھائے کوئی
اشک آنکھوں کے کیسے چھپائے کوئی
کون کہتا ہے کہ بیگا نہ مہر و وفا ہوں میں

جمال رنگ و روشنی سے ناآشنا ہوں میں
برھنہ تن، گرسنہ ماؤں اور بہنوں کا غم
جا بجا خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کا غم
راکھ کے ڈھیر میں بدلتے گھروں کا غم
کوئی ایک دکھ ہو تو بھلائے کوئی
کون کہتا ہے کہ بیگانہ مہر و وفا ہوں میں
جمال رنگ و روشنی سے ناآشنا ہوں میں
میرا لیلائے وطن کوئی اجاڑ مندر ہو جیسے
غنیم کے ہاتھوں لوٹا ہوا شہر ہو جیسے
افلاس کا آسیب زدہ گھر ہو جیسے
ایسے حالات میں کیونکر رہوں خاموش مجھے سمجھائے کوئی
کون کہتا ہے کہ بیگانہ مہر و وفا ہوں میں
جمال رنگ و روشنی سے نا آشنا ہوں میں
ننگ و ناموس کے گرانباری احساس سے واقف ہوں
مٹی کی محبت دیس کے مہر و اخلاص سے واقف ہوں
ماؤں بہنوں کی غربت و افلاس سے واقف ہوں
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں کیونکر، مجھے سمجھائے کوئی
کون کہتا ہے کہ بیگانہ مہر و وفا ہوں میں

جمال رنگ و روشنی سے ناآشنا ہوں میں

(مہر نہ زاناں رمیر گل خان نصیر) (۴)

(یا)

دوست کہتے ہیں بہت تلخ ہے تیری زباں
کچھ نہیں کہتے ہو بجز شمشیر و سناں
دوستوں سے دست بستہ عرض ہے میری
پتھر پہ کیا اثر کرتی ہے پھولوں کی زباں۔

(ھمراز گشنت رمیر گل خان نصیر) (۵)

گو کہ میر نصیر کا اسلوب اظہار اور ان کا لب ولہجہ کہیں ایک مقام پر سپاٹ ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان کی شاعری کی زبان انتہائی سادہ، پر اثر اور فنی رچاؤ کا حامل ہے۔ وہ اپنے عہد کے تجربات اور واردات و واقعات کو ایک سچے اور کھرے بلوچ کی زبان میں سیدھے سادے اور دوٹوک انداز میں بیان کرنے کے قائل ہیں۔ ''نصیر تبدیلی کا شاعر ہے۔ وہ ناپسندیدہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرنے والا تخلیق کار ہے۔ اس کی فکر کسی موقع پرستی کے دام میں اسیر نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ اظہار میں کسی طرح کی مصلحت پسندی کو روا رکھتے ہیں''۔ (۴) اصل میں یہ وہ نکتہ اعتراض ہے کہ جس کی بنا پر کچھ نقادان کی شاعری کو بیان محض کا نام دے کر اسے ایک ''جنگی اعلان'' تصور کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے عہد کے معروضی اور موضوعی حالات کے باعث ان کی شاعری ایک مخصوص سیاسی تصورات کے زیر اثر رہا

ہے۔ ایک خاص نظام اخلاق، مخصوص سیاسی تصورات اور ایک واضح نظریہ حیات پر یقین رکھنے کے باعث ان کی شاعری میں ایک قسم کا واعظانہ اور خطیبانہ (Didactic) رنگ نمایاں ضرور ہے لیکن جذباتی وارفتگی، سچائی، خلوص اور دیانت کے باعث انہوں نے احساسات اور جذبات کو نہایت ہی خوبصورتی اور فنی رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شاعری کو شعوری طور پر ایک واضح نصب العین کے حصول کا ذریعہ بنانے اور دوٹوک حقیقت نگاری کے باوجود ان کے یہاں فن ڈھنڈورا یا نعرہ نہیں بنتا۔ قومی ضرورت و مقاصد کا شعور و ادارک رکھنے کے باعث انہوں نے جو دیکھا، محسوس کیا اور جو کچھ ان پر گذرا۔ انہوں نے بقولِ ساحر لدھیانوی نہایت ہی جرات و دیانت سے بیان کیا ہے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔

یا بقولِ فیض احمد فیض

لب پر ہے تلخیِ غمِ ایام ورنہ فیض
ہم تلخیِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے۔

میر نصیر نے اپنے ایک مضمون میں اپنے تلخ اور درشت لہجے کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں اپنے محبوب وطن کی لوٹ کھسوٹ سے منہ موڑ کر، اپنی

قوم کی پائمالی سے آنکھیں چرا کر اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی آہ و بکا سے کان بند کر کے اور میدانوں اور وادیوں میں بکھری ہوئی اپنے نوجوانوں کی لاشوں سے بے دھیان ہو کر اور گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر حسن عشق، گل و بلبل اور رنگت و نکہت کی کوئی داستان چھیڑوں۔ کیا کسی غیرت مند قوم کا کوئی غیور شاعر ایسا کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر مجھ سے وہ کیوں اس طرح کی توقع رکھتے ہیں کہ میں ان کی، شبینہ محفلوں کی مسرت خیزیوں اور سرمستیوں کا آلہ کار بنوں، میں ہر اس شخص سے جو مجھ سے ایسی توقع رکھتا ہے، صاف اور برملا کہتا ہوں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں ایک بلوچ عورت کو بدحال، برہنہ اور دست بستہ نہیں دیکھ سکتا۔ جن کیمپوں میں رہنے اور اذیتیں اٹھانے کا مجھے ذاتی تجربہ حاصل ہے، ان میں موجود بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کا کرب کبھی بھول نہیں سکتا ایسی کیفیت میں، میں اندھا ہو جاتا ہوں۔ اور مجھے گولیوں کی سنسناہٹ اور توپوں کی گھن گرج کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔ یہی میری شاعری ہے۔ میرا یہ اظہار میرے دکھی دل کی بھڑاس ہے۔ جو الفاظ کا جامہ پہن کر شعر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی نوحہ اور کبھی رجز بن کر میری بے چین روح کو تسکین بہم پہنچاتا ہے۔"(۷)

میر گل نصیر نے اپنی نظم "چون کناں" (میں کیا کروں) اور "اعلان" میں بھی اس صورتحال کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

کیا میں جنگ و جدالوں سے متعلق اشعار نہ کہوں؟/ صرف ماہ پیکر دلرباؤں کی ستائش ہی کیا کروں/ دار و رسن کی باتیں کرنی چھوڑ دوں/ میرا دل جو

شدتِ جذبات سے بے قرار ہے/ اسے نہیں مانتا/ میں کیا کروں/ میرا دل/ دھن کے پکے جیالوں کا راستہ چھوڑ نہیں سکتا/ میرا دماغ/ گلرخ نازنینوں سے محبت نہیں کر سکتا/ اور نصیر لڑائی کے دن خاموش نہیں بیٹھ سکتا/ وہ آگ میں کودنے کو لپکتا ہے/ میں کیا کروں؟۔(۸)

ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ ہم زندہ رہیں/ اور اپنی آنکھوں سے/ اپنے وطن اور اپنی جی دار قوم کی تباہی کا تماشا دیکھیں/ اور یہ بھی نہیں ہوگا/ کہ ہم اپنی آنکھیں نیچی کئے اپنے گھروں میں/ محبوب کی زلفوں کے سائے میں پناہ لے کر بیٹھے رہیں۔(۹)

اس اعتراف کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کی شاعری، شاعرانہ حسن وادا اور داخلی احساسات سے عاری ایک جامد اور متعین شاعرانہ طرز وفکر کی شاعری ہے۔ بلکہ ساحر لدھیانوی کے الفاظ میں بات صرف اتنی سی ہے۔

میرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے۔

اصل میں میر نصیر کے ان سرکش ترانوں کے پیچھے سیاسی جبریت کا وہ عمل دخل کارفرما رہا ہے۔ جس سے بلوچستان کے مفلوک الحال عوام مسلسل دوچار رہے ہیں۔ میر نصیر نے جابجا اپنی نظموں میں اس صورتحال کا اظہار کیا ہے۔

یہ دھواں ہے کیسا یہ آگ کیسی
لوگ ماتم کناں کیوں ہیں

یہ کس کا گھر ہے کہ جل رہا ہے
یہ کون ہیں کہ مر رہے ہیں
یہ دستِ عدو کہاں سے اترا
یہ کس کی لاشیں ہیں سر بریدہ
یہ لاش کس کی ہے یہ جنازہ کس کا
یہ کس کا سر ہے کہ جدا ہے تن سے
یہ کس کا بازو ہے کہ کٹ چکا ہے
کس نے بیٹیوں کی ردائیں چھین لی ہیں
کس نے ماؤں کے سر سے چادر اتار لی ہے
یہ گلبدن ہماری بہن اور بیٹیاں ہیں
کہ دستِ جفا نے ان کو رنج وغم میں ڈبو دیا ہے
یاد رکھو یہ چراغ حق کا
ہوا کے جھونکوں سے نہ بجھ سکے گا
یہ نوائے حق ہے یہ صدائے حق ہے
کیوں اسے سن نہ پا رہے ہو تم۔(۱۰)

کتنے جوان مٹ گئے/ اور کتنی زندگیاں برباد ہوئیں/ کتنے دست و بازو ٹوٹ گئے/ اور کتنی آنکھیں لاٹھیوں کی ضربوں سے پھوٹ گئیں/ کتنے گھروں اور مسکنوں کو/ آگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا/ کتنی ہی عورتوں کے دوپٹوں

کی/ اس دورِ ابتلاء میں توہین کی گئی/ اے میری پیاری مادرِ گیتی/ تیرے ناموس کے لئے / کتنے جیالوں، رہنماؤں کی جانیں/ چٹانوں اور گھاٹیوں میں تلف ہوگئیں/ ان گنت ماؤں، بہنوں اور باپ کی/ آنکھوں کے چراغ / بیابانوں میں بجھ کر/ سیلابِ بلا کی لہر میں بہہ گئے۔

(اشتفت ۔۔ میر گل خان نصیر) (۱۱)

ے دلدار کہاں ہے اور وطن کہاں ہے/ گلزار کہاں ہے اور چمن کہاں ہے/ جہاں بہادر جوان پروان چڑھتے اور تربیت پاتے تھے/ اب وہ گاؤں کدھر اور قبیلے کہاں ہیں؟/ سب کچھ گرد و غبار کی دبیز تاریکی میں چھپ گیا ہے/ وہ کہسار کہاں اور پہاڑیاں کس طرف ہیں/ نسیم صبح سے بھی خون کی بو آتی ہے/ عطر اور چنبیلی کی مہک اب کہاں سے آئے/ شبنم کو آنسوؤں کا تار بندھا ہے/ شہسوار کہاں اور عدن کدھر ہے/ دشت، صحرا اور پہاڑ جل کر خاک ہو چکے/ اناج کے ذخیرے کہاں/ اب تو روٹی ھی میسر نہیں آتی۔ (وطن کجا اِنت) (۱۲)

ے مادرِ وطن کے/ جیالوں فرزندوں کو توپوں اور بندوقوں کی گولیوں کے منہ میں/ جاتے ہوئے دیکھتا ہوں/ بلوچوں کے پہاڑ اور وادیاں جل رہی ہیں / زمین میں ان کا خون جذب ہو رہا ہے/ میں کیا کروں۔ (چون بکناں)(۱۳)

ے نہ گاؤں اور بستیوں میں کوئی زندگی باقی رہی ہے
اور نہ ہی میدانوں اور چراگاہوں میں مویشی باقی بچے ہیں۔

(تریاک لنٹ) (۱۴)

میر گل خان نصیر کا عہد چونکہ سماجی اور سیاسی تحرک کی ابتدا کا دور تھا
لیے اس دور میں وطن دوستی اور عوام دوستی کی تحریک کے زیر اثر شاعری کو وطن اور
کے مظاہر سے قریب تر کرنے کی ایک شعوری رجحان سامنے آیا تھا۔ میر نصیر نے
شاعری کے ذریعہ قوم کو جگانے اور ان میں قومی اور تاریخی شعور پیدا کرنے اور ایک
خوشحال معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے سلسلے میں بلوچ قوم کی مجموعی روایتی کردار کو صیقل
کرنے کے ساتھ ساتھ ترقی پزیر رجحان و میلانات کو اپنانے کی ترغیب دی۔"
بلوچی زبان کے شعرا کرام میں پہلے شاعر تھے۔ جنہوں نے قوم میں اشعار کے ذریعے
آزادی کے جذبات کو اُبھارا۔ لوگوں میں شعور پیدا کیا کہ وہ انگریزوں کی غلامی سے
نجات حاصل کرنے کے لیے جتن کریں۔ وہ اس لحاظ سے علامہ اقبال مرحوم کے ہم
پلہ تھے۔ جیسا کہ انہوں نے مذہبی اور سیاسی شاعری کو اپنا کر حکیم الامت کا خطاب
حاصل کیا۔ اسی طرح میر گل خان نصیر مرحوم نے بلوچی شاعری میں عوام کے سیاسی
شعور کو بیدار کر کے بلوچی زبان کے ملک الشعرا ہونے کا شرف حاصل کیا"۔(۱۵)

میر نصیر نے ایک بلند تر اخلاقی سطح سے بلوچ قوم کو مخاطب کر کے ان میں
اتحاد، یک جہتی اور قومی جوش و جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس سے ان کی شاعری
میں داخلی احساسات کی بجائے سماجی اور قومی رخ ایک توانا مظہر کے طور پر سامنے آیا۔
چونکہ میر نصیر کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ بلوچ قوم، سرداروں، نوابوں کی غلامی،
غربت، جہالت اور نا اتفاقی کی دلدل سے نکل کر اپنے اندر ایک باوقار قوم ہونے کا

شعور پیدا کرلیں۔ کیونکہ بلوچستان میں سرداروں، میرومعتبروں کا ٹولہ حکمرانوں کی خوشامد اور کاسہ لیسی کے باعث مراعات و وظائف سے فیض یاب ہو رہا تھا۔ جبکہ بلوچستان کے مفلوک الحال عوام غربت اور جہالت کی زندگی گذارنے پر مجبور تھے، تو اس صورتحال میں یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی توانا اور طاقت ور آواز ابھر کر سامنے آسکے جو بلوچوں کی قومی تشخص کو ایک نیا ولولہ اور جذبہ عطا کرے۔

میر نصیر نے اپنے فکر و عمل کے ذریعے یہ فریضہ نہایت ہی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ انہوں نے اپنے عہد کے تقاضوں اور وقت کے بدلتے رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے نہ صرف بلوچی شاعری کو یوٹوپیائی تصورات کے تنگنائے سے نکال کر ایک نئی مزاحمتی روایت کا احیاء کیا بلکہ خارجی دباؤ، طبقاتی جبر و تشدد اور لوٹ کھسوٹ پر مبنی استحصالی نظام کے خلاف باغی ہونے کا نعرہ بھی سب سے پہلے انہوں نے بلند کیا۔ یہاں ان کی مشہور نظم "من یاگیاں" (میں باغی ہوں) کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئیے۔

آگ ہوں، برق تپاں ہوں، شمشیر ہوں میں
توپ ہوں، بم ہوں، تقدیر ہوں میں
عدو سے برسرپیکار ہوں
میں باغی ہوں، میں باغی ہوں
میں کسی کا بندہ نہیں آزاد ہوں میں
میں کسی کا رعیت نہیں ہم مرتبت و ہمراز ہوں میں

میں کسی کا محتاج نہیں مونس و غمخوار ہوں میں
میں کوئی چور نہیں ہوں
میں باغی ہوں ، میں باغی ہوں
میں سیم و زر کو اپنا خدا نہ کہوں
مال و دولت کو زیست کا مدعا نہ کہوں
میں سگ گرسنہ کی طرح ہڈی پہ جھپٹ نہ پڑوں
میں تو کاسب ہوں
میں باغی ہوں، میں باغی ہوں
میں تیرو تفنگ سے کھیلوں گا
جگ سے ظلم مٹا دوں گا
مفت خوری پہ عائد جرم کروں گا
جاگیر داروں کو میں لوٹوں گا
میں باغی ہوں، میں باغی ہوں
میں حق کی خاطر جنگ کروں گا
اپنے لہو سے زمیں کو گلرنگ کروں گا
میں غدارانِ وطن پہ بجلی بن کر ٹوٹ پڑوں گا
میں سچ کہوں گا
میں باغی ہوں ، میں باغی ہوں

میں بند کروں گا لوٹ کھسوٹ کے سارے دروازے
میں ظلم کو جڑ سے نوچوں گا
دھرتی کو دلہن بنالوں گا
دیس کو میں آزاد کروں گا
میں باغی ہوں ، میں باغی ہوں
مزدور اور دہقان کا اکھ بنالوں گا
جبہ و دستار کے وارث لوگوں کو جیتے جی درگور کروں گا
میں نفع ونقصان کے سب حساب چکا دوں گا
ان کی ہڈیوں کو جلا کر راکھ کروں گا
میں باغی ہوں ، میں باغی ہوں
نصیر ہم نے تو جاں اپنی ہتھیلی پہ سجالی ہے
ہم شوریدہ سروں کا، موت سے آنکھ مچولی جاری ہے
اب دور آیا غریبوں کی باری ہے
میں ببانگ دہل اعلان کروں
میں باغی ہوں، میں باغی ہوں۔ (۱۶)

میر نصیر کی شاعری کا پہلا مجموعہ جو ''گلبانگ'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں نصیر کا ابتدائی کلام شامل ہے۔ ''گلبانگ'' کو پڑھنے کے بعد بجا طور

پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں وہ زور بیان اور شاعرانہ اظہار و فکر موجو
نہیں ہے جو اس کے بعد کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے۔ گلبانگ کا شاعر مولانا حالی
مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر علامہ اقبال اور غالب کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ یہاں
یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ میر نصیر نے اپنی شاعری کا آغاز بھی اردو شاعری ہی سے کیا
تھا۔ دراصل یہ وہ زمانہ ہے کہ جب برصغیر میں دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی کی
تحریکات کا آغاز ہو چکا تھا۔

برصغیر کی تحریک آزادی نے بلوچستان کے تعلیم یافتہ نوجوان اور باشعور عوام
میں بھی قومی بیداری کی ایک لہر پیدا کی تھی۔ بلوچ عوام میں اتحاد، یک جہتی اور قومی
جوش و جذبہ پیدا کرنے کی خاطر اس وقت کے مشہور سیاسی و سماجی رہنما میر یوسف عزیز
مگسی اردو شاعری سے ہی کام لیتے تھے۔ اس طرح میر نصیر اور محمد حسین عنقا نے بھی
اپنے عوام کی جذبہ حریت کو ابھارنے کے لئے سب سے پہلے اردو شاعری کو ہی اظہار کا
وسیلہ بنایا۔ لیکن میر نصیر نے جلد ہی اردو شاعری کو خیر باد کہہ کر اپنے عوام ہی کی زبان
میں شعر و سخن کا آغاز کیا۔

میر گل خان نصیر چونکہ مولانا ظفر علی خان، مولانا حالی اور علامہ اقبال کی ملی
اور سیاسی شاعری سے متاثر تھے۔ وہ شروع میں انہی کے رنگ میں بلوچی میں شعر کہتے
رہے۔ لیکن کلاسیکی بلوچی شاعری کے بخوبی اور گہرے مطالعہ کے بعد اس نے اس
رنگ کو ترک کر کے اپنے فکر و فن کے لئے ایک علیحدہ اور جدا راستے کا انتخاب کیا۔ میر
نصیر نے قدیم بلوچی شاعری کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ بالخصوص جام درک، ملا

فاضل، مست توکلی، بالاچ گورگیج، ریکئی، ملا مزار بنگلزئی، گدومری اور رحملی مری کی شاعری کا بھی بغور جائزہ لیا۔ اور انہی شعراء کے مطالعہ نے ہی اس کی شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ اور بلوچی شاعری کی خوبصورت شعری روایت اور خصوصیت کو ایک تسلسل کے طور پر آگے بڑھاتے ہوئے نہ صرف انہوں نے شاعری کی افادیت کا کھل کر اعلان کیا بلکہ جدید بلوچی شاعری کی عمارت کو اس توانا اور قدیم شعری روایت کی مضبوط بنیادوں پر استوار کی۔ جو ادب کو ایک اعلیٰ اور ارفع سماجی عمل سمجھتی تھی۔ میر نصیر اپنے فکر و فن کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''میری شاعری میں اس میں شک نہیں کہ وطن سے اس فطری محبت کے علاوہ کسی حد تک قبائلی عصبیت کا بھی عمل دخل رہا ہے۔ مگر بلوچی کے قوم پرور شعراء کے کلام نے میرے دل میں بچپن سے ہی حب الوطنی کے جذبے کو سب سے زیادہ ابھارا ہے۔ جن کے کلام کو سننے اور ازبر کرنے کا میں ہمیشہ سے مشتاق رہا ہوں۔ شاعر ریکئی میرے قبیلہ کے ''ریزوار'' (قومی) شاعر ہیں۔ اور خان میر خداداد خان کے دربار کے ملک الشعراء گذرے ہیں۔ بالاچ گورگیج جن کو میں بلوچوں کا عظیم قوم پرور شاعر مانتا ہوں۔ ابتدائے عمر سے ہی میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان شعراء کے کلام نے میرے دل پر جو نقش مرتب کئے۔ بلاشبہ عمر کے ساتھ ساتھ ان میں زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی رہی اور ان کا کینوس بڑھتا اور پھیلتا رہا ہے''۔ (۱۷)

میر نصیر کی شاعری میں گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی گئی اور بدلتے حالات کے تناظر میں ان کے فکر و فن کا دائرہ زیادہ وسیع اور گہرا ہوتا گیا۔ ان کا

قومی جذبہ واحساس جوان کی شاعری کی بنیادی اور مرکزی سطح سے رفتہ رفتہ بین الاقوامی طرز احساس میں ڈھلتا گیا۔ اس عالمگیر سوچ کے باعث ان کی ''قومی شاعری میں ترقی پسند تصورات در آتے گئے۔ اگر ان کی شاعری کو دیکھا جائے تو اس میں زیادہ تر کاشتکار، مزدور اور محنت کشوں کے دکھ اور مصائب کا اظہار ملتا ہے۔ نصیر کی شاعری نے گل وبلبل سے آغاز کیا تھا۔ اور (Aggresive Nationalism) کی طرف چلا گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ ان کی شاعری میں پختگی آتی گئی۔ یہ پختگی ترقی پسندی کے قالب میں ڈھل کر عوامی ترقی پسندی کی معراج تک پہنچ گیا۔ وقت اور حالات نے ان کے فکر کو زیادہ پختہ اور محکم کیا۔ اسی پختگی نے ان کی شاعری کو ایک جداگانہ لہجہ عطا کیا۔ اور اس کو صرف انہی کا لہجہ کہا جا سکتا ہے۔'' (۱۸)

میر نصیر کی شاعری کا تخاطب عوام ہے اور وہ بلاشبہ اپنے عہد کے وہ دیومالائی شخصیت ہیں۔ جنہوں نے اپنی سرزمین کی بقا اور عوام کی خوشحالی کے لئے نہ صرف بحیثیت ایک قومی شاعر ان کی امنگوں، آرزوؤں، خوابوں اور ان کے آدرشوں کی بھرپور نمائندگی کی بلکہ انہوں نے اس جدوجہد میں براہ راست شرکت کر کے ان کے ساتھ اپنی والہانہ محبت اور عمل وابستگی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اور وہ اس مقصد کے لئے کبھی جیل کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں رہے اور کبھی اپنی سرزمین پر اپنے ہی گھر میں محبوس رہے۔ لیکن یہ شخص اپنے اصولوں اور نظریات سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہوئے۔ ''برزیں دیوال'' (حصار زنداں) میں وہ اپنی اسی یقین واعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ سر بفلک قلعے
یہ سنگ و آہن کی دیواریں
تنگ و تاریک در اور یہ کھنکتی زنجیریں
فکر انسان کو پابہ جولاں نہیں کر سکتے
ہر عہد میں آمر و فرعونوں نے
قدم قدم پر قتل گاہیں اور زنداں بنائے تھے
مگر سچ کی گواہی دینے والوں نے
حرمتِ لفظ کے پاسداروں نے
فصیل جسم پر زنجیریں سجا کر
قتل گاہوں کو رونق ڈالا تھا
شعور تو روشنی ہے
جسے پسِ زنداں نہیں کیا جا سکتا
یہ امید کی وہ کرن ہے
جو شکستہ دلوں اور خستہ جانوں کے حوصلے بڑھاتا ہے
یہ سچ ہے کہ موت کے سوداگروں اور لہو فروشوں نے
جابر و آمر اور اپنے عہد کے خداؤں نے
اپنی جھوٹی جاہ و حشم کے بل بوتے پر
سروں کے مینار سجائے تھے

مگر حریت فکر کو قتل نہیں کیا جا سکتا

شعور کو سرنگوں نہیں کیا جا سکتا۔ (۱۹)

''برزیں دیوال'' (حصار زندان) کے علاوہ ''اعلان'' اور ''چون بکناں'' (کیا کروں) کی نظمیں بھی اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔

ہمارے سامنے اگر کوئی پہاڑ آ جائے/ کوئی سمندر آئے/ یا کوئی آگ بھڑک اٹھے/ ہمارا دل کبھی نہیں کانپتا/ اور نہ ہی ہمارے کبھی قدم ڈگمگاتے ہیں/ ہمیں اپنی ہمت اور حوصلہ پر ناز ہے۔ (اعلان) (۲۰)

جواں مردوں کے لئے/ جدوجہد کا ایک ہی راستہ ہے/ اپنے خون میں نہانے اور قربانی دینے کا/ یہی منزل کی طرف بڑھنے کا راستہ ہے/ جو گولیوں کی حدت سے آلودہ فضا میں سے ہو کر جاتا ہے۔ (چون بکناں) (۲۱)

''گل خان نصیر، جس کی تمام تر زندگی قید و بند میں گزری، ون یونٹ کے دوران سب سے زیادہ قصوروار وہی ٹھہرائے گئے کیونکہ ان کی شاعری میں ان تمام ناانصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف کھل کر بغاوت کا اظہار کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں جب ملک میں پہلا مارشل لاء ایوب خان کی سربراہی میں لگا تو ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں، کارکنوں، ادیبوں اور دانشوروں کو یا تو شاہی قلعہ بھیج دیا گیا یا پھر ملک کے زندانوں کی سیر کرائی گئی۔ بلوچستان میں کوئٹہ کے مقام پر فوجی چھاؤنی میں ایک فوجی اذیت گاہ قائم کی گئی جو بلوچستان کی سیاسی تاریخ میں ''قلی کیمپ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہاں دیگر سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کے ہمراہ بلوچی کے مشہور شاعر محمد

حسین عنقا اور گل خان نصیر بھی قید تھے۔ اس ظلم و تشدد کے خلاف ''قلی کیمپ'' میں بھی گل خان نصیر نے جو اشعار تخلیق کئے، وہ گل خان نصیر کی شاعری کا بہترین حصہ سمجھے جاتے ہیں'' (۲۲)

میر نصیر کی شاعری میں نکھار اور ان کے فن میں پختگی ان کے قید و بند کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ قید و بند کی صعوبتوں اور جیل کی تنگ و تاریک فضا ان کے فکر و فن اور ان کے مشاہدات و تجربات کے لئے ایک نیا حوالہ بن کر سامنے آیا۔ انہوں نے جیل میں رہ کر زندگی کا بھرپور مشاہدہ کیا۔ کیونکہ یہاں انہیں زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جیل کی تنہائی نے میر نصیر کو اپنے وجود سے باہر کی دنیا چھین لینے اور ان کی شخصیت کو بکھرنے اور دھندلانے کی بجائے انہں اپنے اندر اور باطن میں جھانکنے کا حوصلہ عطا کیا۔

جیل کے حوالے سے میر نصیر لکھتے ہیں ''ہمیں چونکہ زندہ رہنا ہے اور اسی زندہ رہنے کی تڑپ نے ہی ہمیں زندان کی اس کالی کوٹھڑی کو آباد کرنے کی جرات دی ہے۔ اس لئے ہم سیاسی کارکنوں کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پس زنداں رہ کر بھی، زندگی کو جلا بخشنے اور کار آمد بنانے کے لئے کوئی کام کریں تا کہ ہمارا وقت ضائع نہ ہو جائے۔ ہم مصروف رہیں تا کہ سستی اور کاہلی ہم پر غلبہ نہ پائے اور ہمارا مسلک نظروں سے اوجھل نہ رہ سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کے لئے کچھ ایسے آثار چھوڑ جائیں جو قوم اور وطن کے لئے مفید ہوں اور جن سے استفادہ کیا جا سکے۔'' (۲۳)

ایک اور جگہ میر نصیر لکھتے ہیں کہ ’’گذشتہ تیس چالیس برسوں سے اپنے متواتر میں، ان کے جبر و ستم کا نشانہ بنا چلا آتا ہوں۔ لیکن مجھے ان سے گلہ ہے اور نہ ہی اس پر نادم ہوں۔ بلکہ اس کے برعکس، اس خیال سے سرشار رہتا ہوں کہ حسب مقدور اپنی قوم اور وطن کے کام آ رہا ہوں۔ اس وقت بھی جب یہ سطور لکھ رہا ہوں سنٹرل جیل مچھ میں تین سال گذارنے کے بعد اب سنٹرل جیل حیدرآباد میں محبوس ہوں۔ پچھلے چار سالوں سے، جیل و زنداں کی صعوبتیں جھیل رہا ہوں۔ اور شاداں ہوں کہ اس عمر میں بھی میرے حوصلے اب تک پست نہیں ہوئے۔‘‘ (۳۴)

میر نصیر کی شاعری کا بڑا حصہ گوشہ زنداں میں ہی لکھا گیا۔ قید و بند کے سخت ترین ایام میں مشق سخن کے ساتھ ساتھ انہوں نے قدیم بلوچی شاعری اور بلوچستان کی تاریخ پر بھی لکھنا شروع کیا۔ جیل کی تنگ و تاریک فضا اور آہنی سلاخوں کے پیچھے بظاہر وہ باہر کی دنیا کے تمام تر ہنگاموں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ لیکن حقیقت میں اپنے عوام اور لیلائے وطن سے ان کا رشتہ لمحہ بھر کے لئے بھی ٹوٹنے نہ پایا۔ بلکہ جیل کی دیاری تجربے سے گذر کر اپنے عوام اور وطن کے ساتھ ان کا رشتہ اور بھی پائیدار اور معتبر ہوتا گیا۔

هم مست و شیدا اسپر گ کی مانند
نہ کسی مہ جبیں کے لئے نہ کسی گرانک کے لئے
قید و بند کی سختیوں میں گھر گئے ہیں
ہم تو اپنے وطن کے کہساروں، مرغزاروں،

آبشاروں کی خاطر
آگ کے دریا میں گھر گئے ہیں
تاریک زنداں کے نذر ہو گئے ہیں۔ (نہ پہ گرانک ءَ)(۲۵)

تخلیقی سطح پر وطن اور اس کے مظاہر سے عشق (Romance) جہاں ایک طرف میر نصیر کے فن کا مرکزی نقطہ اور نظریہ تھا۔ تو دوسری طرف عملی سطح پر ان کی پوری زندگی اسی رومانس کے نبھانے اور سلجھانے میں گذری ہے۔ یہ وطن اور عوام کی محبت ہی تھی کہ جس کی خاطر وہ جیلوں میں سڑتے رہے۔ لیکن ان کے عشق میں کسی بھی مرحلے پر کوئی کجی اور کوئی کوتاہی نظر نہیں آئی۔ بلکہ یہ عشق سختیوں اور صعوبتیں جھیلنے کے بعد مزید پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی۔ محبت کے اس سفر میں ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی ان کے انقلابی گھن گرج میں ان کی جذبہ حریت میں کوئی رقت نہیں آئی۔ وطن اور عوام سے محبت کے باعث میر نصیر اپنی زندگی ہی میں ''Legend'' بن گئے تھے۔ اگر اس ''Legend'' کو دیوتا کہا جائے تو بھی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ کیونکہ عوام سے بے پناہ محبت، غیر متزلزل یقین اور انتھک جدوجہد کی بدولت وہ ایک بے مثال دیومالائی کردار میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔

عوام کے ساتھ بھرپور کومٹ منٹ کے باعث ہی میر نصیر کو نہ صرف بلوچ موومنٹ (Movement) کے شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے بلکہ وہ بیک وقت بلوچ قومی تحریک کے ادیب، سیاستکار، مورخ، محقق، دانشور، صحافی اور اس سے بڑھ کر وہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے سامنے آئے۔ حالانکہ وہ اپنے قبیلہ ذگر مینگل کے

سردار خیل سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بالائی کلاس کی نفی کرتے ہوئے خود کو عوام کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اور وہ آخر دم تک عوام کے ساتھ رہے، عوام کی بات کرتے رہے اور عوام کی جنگ لڑتے رہے۔

ان کی مشہور نظم ''اُستمان ءِ شاعر'' (عوام کا شاعر) کا کینوس جو نہایت ہی وسیع اور تہہ دار ہے، اپنے اندر نہ صرف پوری مظلوم و محکوم انسانیت کے غم والم کو سمیٹے ہوئے ہے بلکہ دنیا بھر کے کچلے اور پسے ہوئے طبقات کے ساتھ ان کی مکمل وابستگی اور یک جہتی کا بھرپور اظہار یہ بھی ہے۔

فیض احمد فیض اپنی مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' میں غمِ عشق کی راہ میں حائل غمِ حیات کی جھنجھٹوں کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ زندگی کی کشمکش، سماج کی زبوں حالی، درماندگی اور بے چارگی عشق کے رشتے کو استوار نہیں رکھ سکتی۔ بعینہ ایسی صورتحال سے میر نصیر اپنی نظم ''عوام کا شاعر'' میں دوچار نظر آتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں بہار کی رعنائیوں اور رنگینیوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ماہ لقاؤں کی کیف آگیں محفلوں سے اسے کوئی واسطہ ہے۔

بہار کی رنگینیوں اور حسن و بزم کی محفلوں سے میر نصیر کی بے اعتنائی، فیض احمد فیض کے غمِ حیات کے قریب تر ہے۔ فیض ہی کی طرح میر نصیر بھی غمِ حیات اور غمِ دوراں کی چلچلاتی دھوپ میں ایک تناور پیڑ کی طرح اپنا سایہ بانٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میر نصیر اسی نظم میں کہتے ہیں کہ جب تک میرے قلم میں توانائی اور قوت موجود ہے وہ اپنے لہو سے زندگی کی داستاں رقم کرتا رہے گا۔

میرے ہاتھ میں امانت یہ قلم
حسن اور عشق کے قصوں کا روادار نہیں
دولت و شہرت و منصب اسے درکار نہیں
میں کہ شاعر ہوں مگر میرا ہنر، میرا سخن
اک نئے طرز کا ، آدرش کا آئینہ ہے

میرا ہنسنا میرا رونا ہے انہیں کی خاطر (اُستمان ہ شاعر)(۲۶)

میر نصیر کے برعکس فیض احمد فیض نے اس خیال کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

میر نصیر اپنی اسی نظم میں آگے چل کر انتہائی یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ میری شاعری سورماؤں اور بہادروں کی لازوال قربانیوں کے اعتراف میں انہیں ہمیشہ خراجِ تحسین پیش کرتی رہے گی اور اس دھرتی کے بے کس اور بے بس مظلوم انسانوں کے جذبہ شوق اور دلوں کو گرماتی رہے گی اور پرعزم نسلِ نو کے دلوں میں عوام کی دائمی کامیابی و کامرانی کے لئے جدوجہد کی علامت بن کر ابھرے گی۔

فیض احمد فیض نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ شاعر کے گیت عوام کے سب سے بڑے مونس و غمخوار اور مرہم آزار ہوتے ہیں۔ لیکن عوام کے دکھوں کی چارہ گری ان گیتوں کی بس کی بات نہیں۔ فیض آگے چل کر کہتے ہیں کہ اگر مجھے اس بات کا یقین

ہو کہ آبشاروں، بہاروں اور مرغزاروں کے گیت عوام کے دکھوں کا مداوا بن سکتے ہوں تو میں ان کی خاطر عمر بھر نت نئے گیت بنتا رہوں گا۔

فیض احمد فیض کی طرح میر نصیر بھی اسی بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جدوجہد کے بغیر عوام کے دکھوں کا مداوا کرنا ممکن نہیں ہے اور حسن و عشق کے خوابیدہ گیت بہر طور کسی دکھ اور زخم کا مرہم نہیں بن سکتے اور یہی وجہ ہے کہ میر نصیر کی شاعری میں حسن و عشق کے مجرد اور افلاطونی تصورات کا عمل دخل سرے سے ہی مفقود ہے۔

''بیا او مرید دیوانگیں'' میں میر نصیر، شہ مرید سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم تو صرف اپنی ہانی کا دکھ لئے سرگرداں و پریشاں ہے۔ اور ہانی کی حسن کی خیرات کے لئے تم نے کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ مگر تم اس دشتِ ناسپاس میں اکیلا نہیں بلکہ یہاں تیری طرح سینکڑوں شہ مرید اپنی محبت کے چھن جانے پر نوحہ کناں ہیں اور تمہاری محبت تو صرف اور صرف ہانی کی ذات اور اس کے حسن کی رعنائیوں تک محدود ہے جبکہ ہم تو اپنے ''لیلائے وطن'' کی محبت کو دل میں ترازو کیئے ہوئے مدتوں اس کے غم میں خوار و بے قرار ہیں۔

؎ آ جا مرید، آجا مرید
آجا او دیوانہ مرید، دیوانہ و مستانہ مرید
آجا کہ محفلِ دل سجالیں، قصہ درد سنالیں
تمہیں عشق کی آگ نے بھون ڈالا
ہمیں فکر امروز نے مار ڈالا

مرمٹ گئے تم ہانی کی نازک اداؤں کی خاطر
مگر ہم کو بیخود کیا چاہتِ شہرِ یار وطن نے
چاکر کے دستِ جفا نے تیری محبت پہ شبخون مارا
مگر ہم ہیں کہ ہم سے پرکھوں کی سرزمین چھین لی ستمگرانِ دہر نے
لبادہ فقیروں کا پہن کر وطن کو الوداع کہہ گئے تم
مگر وطن کی محبت کی خاطر جیلوں کی رونق بڑھاتے رہے ہم
چاکر کے رحم و کرم پر ہانی کو چھوڑ کر چلے تم
مگر تم دیکھنا ہانی کی سرزمین کی خاطر ہم جان واریں گے اپنی
وطن چھوڑ کر عازمِ مکہ ہوئے تم
مگر کسی بھی جاہ وحشم کے ڈر سے وطن نہ چھوڑیں گے ہم
دور بہت دور مکہ کی سرزمین پر درد کے گیت بنتے رہے تم
لیکن جیل کے تنگ و تاریک سلاخوں کے پیچھے
حدیثِ درد دل لکھتے رہے ہم
ہجر کی آگ سے اپنا جسم و جاں جلاتے رہے تم
مگر قہر و جبر کی کڑی دھوپ میں سلگتے رہے ہم
ہاتھ میں کشکول وعصا تھام کر زندگی سے الگ ہو گئے تم
ہم شوریدہ سر جاں ہتھیلی پہ سجا کر
قتل گاہوں کی جانب لپکتے رہے

فقر کی برکتوں سے منزلِ مراد پاگئے تم
ہم بھی جانثارانِ وطن صبح مراد پالیں گے اِک دن
مجھ میں اور تجھ میں فرق کچھ بھی نہیں
ہمارا درد مشترک ہے غم مشترک ہے
ہانی کے عشق میں بیگانہ عقل و خرد ہوگئے تم
ہم وطن کی چاہت میں ہوش کھو بیٹھے ہیں اپنے
لفظ و عشق کی تاریخ میں خود کو امر کر گئے تم

ہماری یاد بھی وقت کے سینے میں دھڑکتا رہے گا۔ (میر گل خان نصیر) (۲۷)

میر نصیر کی یہ نظم اپنی سرزمین اور دھرتی کی محبت میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ ''وطن'' نصیر کی محبت کا سرچشمہ ہے اور ان کی شاعری کا ''مرکزی نکتہ'' ہے۔ وہ اپنے لیلائے وطن کے ساتھ ساتھ اس کی باسیوں اور اس کے وارثوں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کی یہی لازوال اور بے لوث محبت قبر تک ان کے ساتھ رہی۔

کیا ہے وطن کی محبت میں کچھ کہہ نہیں سکتا
یہ اک جذبہ دل ہے میں کچھ کہہ نہیں سکتا
یہ کرب آگہی ہے جو دل کو ڈستا رہتا ہے
یا یہ ایسا نشہ ہے جو اتر نہیں سکتا
کیا ہے وطن کی محبت میں کچھ کہہ نہیں سکتا
یہ اک گماں ہے جو شکستہ دلوں کے حوصلے بڑھاتا ہے

یا اک خیالِ جانفزا ہے جو مجھے بے قرار رکھتا ہے
یہ اک کسک ہے جو مجھے بیخود بنائے رکھتا ہے
یہ وطن کی محبت ہے یا کوئی جذبہ دگر ہے
میں کچھ کہہ نہیں سکتا
یہ اک آہِ نیم شب ہے
جو دل میں درد کا دیا جلائے رکھتا ہے
یہ آنسوؤں کا دریا ہے جو چشمِ غم سے ٹپکتا رہتا ہے
یہ وہ رنگ ہے جو دھنک کی لڑی سے ٹوٹا ہے
یہی ہے وطن کی محبت میں کچھ کہہ نہیں سکتا
یہ اِک نوا ہے جو غیب سے دل میں اترتا ہے
یہ اک گل ہے جو لہو سے اپنی خوشبو کشید کرتا ہے
یہی ہے گر وطن کی محبت میں کچھ کہہ نہیں سکتا
یہ اک شعلہ ہے جب لپکتا ہے تو دل میں اک گماں سر اٹھاتا ہے
یہ اک للکار ہے جب سنائی دیتی ہے
تو دل میں اک ولولہ ابھرتا ہے
یہ اک حوصلہ ہے جو رگ و پے میں لہو کی طرح سماتا ہے
یہ اک گیت ہے جو گنگناتا ہے
یہ اِک ساز ہے جو دل کے تاروں سے مچل اٹھتا ہے

یا یہ اک نور کی کرن ہے جو دھرتی سے جلا پاتی ہے
یہی ہے وطن کی محبت میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ (وطن وہ میں) (۲۸)

☆

ـ نہ جانوں کہ میں کیوں اتنا وطن کا شیدائی ہوں
اور بھی لاکھوں لوگ ہیں
کہ انہوں نے اسی خاک سے جنم لی ہے
وہ اسی دھرتی کا رزق کھاتے ہیں
اس کی روشنی سے فیض پاتے ہیں
(لیکن) ہر روز نئے آقاؤں کو سلام کہنے جاتے ہیں
مگر وہ محکوم زندگی کا گلہ نہیں کرتے
میری طرح وطن کی محبت میں
اشک بہایا نہیں کرتے (من نہ زاناں) (۲۹)

☆

ـ اے وطن کی خاک تم مجھے زندگی سے دوست تر ہو
تم میرا نورِ نظر ہو، چاندنی سے دوست تر ہو
تیری مٹی جب غبار بن کر میری آنکھوں میں گرے
وہ خاک مجھے سرمۂ نظر کی روشنی سے دوست تر ہے (اے خاکِ وطن) (۳۰)

☆

بڑے پتھروں کے تراشی ہوئی دیوار
جیل کے تاریک آہنی دروازے
ایک پل کے لیئے سوچ کی رو
بجلی کی طرح ذہن میں کوند جاتی ہے
روح کسی آوارہ طائر کی طرح
آسمان کی وسعتوں میں محو سفر ہوتی ہے
لفظ موتیوں کا پھنوار بن کر
محبوبہ کے سر پر برستی ہیں
چاند محبوبہ ہے
اور وطن محبوب کا ٹھکانہ ہے
محبوبہ کی یاد میں دل سے ٹیسیں اٹھتی ہیں

مگر ماں کی محبت کو بیٹے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ (اومان) (۳۱)

وطن اور اس کے مظاہر سے محبت ہی نصیر کی شاعری ہے۔ ان کی زندگی ہے۔ ان کی تمام تر جدوجہد اپنے وطن کی خوشحالی، عوام کی باوقار رہائی اور جمہوریت کی سربلندی سے عبارت ہے۔ عوام دشمن اور استحصالی قوتوں کے خلاف وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھے۔ ایک کوہ گراں تھے۔ ''بلوچستان کے سماج میں دو متحارب، مخاصم اور برسرپیکار معاشی طبقات کی سائنسی دریافت ان کی نظریات کی Achievement تھی۔ اور جیلیں جلاوطنیاں، قلی کیمپ ان کی جسمانی قربانیاں

اس Achievement کو عملی شکل دینے کی جدو جہد تھیں۔ سرداری فیوڈل نظام کے خلاف جتنی شاعری، گل خان نے کی۔ اتنی شاعری اردو، ہندی سمیت ہماری پڑوسی زبانوں نے مل کر بھی نہ کی ہوگی۔'' (۳۲)

ے یہ بڑے طروں اور کلاہوں والے امیر اور دولت مند لوگ/ اپنی پامال زندگی اور بے غیرتی کے کاموں پر/ نہ تو نادم ہوتے ہیں/ اور نہ ہی انہیں شرم آتی ہے/ انہوں نے بلوچی غیرت وحمیت کو روپوں کے عوض گروی رکھ دیا ہے/ اور زندگی سے بھی عزیز تر اپنی قوم کے ننگ و نام کو/ ان تلخ اور خوف والم سے پر ایام کے عوض فروخت کر دیا۔'' (پل دپ) (۳۳)

ے یہ وطن ہمارا ہے اور ہمارا رہے گا
اگر قبرستانوں کی تعداد بڑھتی ہے تو بڑھنے دو
مگر یہ ریش گاؤ اور بنی بریدہ سردار
ہمارا آقا نہیں رہیں گے۔ (پل دپ) (۳۴)

☆

ے عیش ونشاط کے یہ دلدادہ معتبر کہ یہاں غرور سے پھرتے ہیں
مگر یہ انسان کے شکل میں یہ بھیڑیا ہیں، رہزن ہیں
سامراجیت کے پٹھو ہیں، دلال ہیں
وطن کے دشمن ہیں
خونخوار درندے ہیں

انہیں یہاں سے بھگانا ہے

یہ جب تک یہاں ہیں

غلامی کی زنجیر ٹوٹ نہیں سکتی۔ (من نہ زاناں) (۳۵)

میر نصیر نے ایک ایسے دور میں سرداری اور فرسودہ قبائلی نظام حیات کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ جہاں یہ نام نہاد اور فرسودہ نظام اپنی پوری قوت اور جاہ وجلال کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن انہوں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر سرداروں، نوابوں اور استحصالی ٹولے کے خلاف برملا اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ غریب اور پس ماندہ عوام کو ان کے خلاف منظم کیا۔ میر نصیر کے اس عمل سے ایک طرف عوام میں انکی مقبولیت اور ہر دلعزیزی بڑھتی جارہی تھی اور دوسری جانب سرداری نظام کے پرستار اور فرسودہ نظام کے محافظ ان کی اس مقبولیت سے پریشان تھے۔ چنانچہ بہت دور اولمپس کی بلندیوں سے زیوس کے ایلچی ہرمیز کو گل خان کو اس راہ سے بہکانے کے لئے جس کا مقصد پرومی تھیئس کی طرح انسانوں میں آگ کی روشنی پھیلانا تھا مقرر کیا گیا۔ گل خان کو انعام واکرام اور آسائشوں ونعمتوں کا راستہ بتایا گیا۔ اگر وہ اپنا نصب العین ترک کردیتے تو وہ تمام نعمتیں ان کے قدموں میں نچھاور کی جاتیں۔ بہ صورت دگر پرومی تھیئس کی طرح زنجیریں اور قید وبند کی صوبتیں ان کا مقدر ہونی تھیں۔

میر گل خان نصیر بالکل ہی نہ ڈگمگائے اور انہوں نے وہی فیصلہ کیا۔ وہی جواب دیا جو پرومی تھیئس نے زیوس کے ہرکارے ہرمیز کو دیا تھا۔ میں اپنی زنجیروں کو غلامانہ زندگی کے عوض ہرگز نہ دوں گا۔ زیوس کی غلامی تو چٹانوں کے ساتھ زنجیروں

سے جکڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ میر گل خان نصیر کی تمام زندگی زنجیروں کی نذر ہو گئی۔(۳۴)

ادیب جو اپنے سماج اور عہد کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد کے معروضی اور موضوعی صورتحال کا ادراک کرتے ہوئے عوام کے لیے فکری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے۔ اور ایسا زندہ اور سچا ادب تخلیق کرے جو ایک فکری تحریک کا باعث بنے میر نصیر نے بجا طور پر اپنے عہد کی صورتحال کا درست ادراک کرتے ہوئے نہ صرف اپنے جمہور کی رہنمائی کی بلکہ ادب کو ایک متحرک قوت بنا کر بلوچی شاعری میں ایک نئی مزاحمت اور احتجاج کی بنیاد رکھی۔ اور ان کا یہ انکار آئندہ چل کہ بلوچی شاعری میں ایک مستقل مزاحمتی اور فکری تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ بلوچستان کی مخصوص صورتحال کے تناظر میں نصیر کے ہاں انکار اور احتجاج مستقل ایک موضوع رہا۔ کیونکہ میر نصیر ایک سچے ادیب کی طرح اپنے ماحول اور اس کے جبر کے خلاف کسی قسم کا سمجھوتہ یا مصلحت کے قائل نہ تھے۔ یہاں میر نصیر کی نظم ''چپ نہ باں'' ملاحظہ کیجئے۔

ستم کو ستم، ظلم کو ظلم کہوں گا چپ نہ رہوں گا
یہ جان جائے، تو جائے سچ کہوں گا چپ نہ رہوں گا
ستم کرو ، قتل کرو ، لاکھ کرو ظلم و جفا
تختہ دار پہ بھی سچ کہوں گا چپ نہ رہوں گا
میں کوئی پروانہ نہیں ہوں کہ راکھ ہو جاؤں گا اک دم

میں تو شعلہ ہوں جلتا ہی رہوں گا چپ نہ رہوں گا
مجھے قید و بند کی سختیاں کیا ڈرائیں گے
تیروں کی بارش میں بھی حق کہوں گا چپ نہ رہوں گا
دل زخم زخم ، سینہ فگار، لخت لخت ہے جگر
آخری دم تک لڑتا رہوں گا چپ نہ رہوں گا
میں نے نصیر سے پیمانِ وفا کی ہے
آزاد ہوں گا یا مروں گا چپ نہ رہوں گا۔ (۳۷)

ژاں پال سارتر نے کہا تھا کہ ''معصوم ادب تو سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم معصومیت سے نہ بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔'' (۳۸) میر نصیر بھی ایسے ادب کے قائل نہ تھے جو ان کے نزدیک نہ صرف معصوم ہو بلکہ اس میں اتنی سکت بھی نہ ہو کہ وہ بول سکے۔ میر نصیر تو بریس پارین (Brice Parrin) کی اس حقیقت پر یقین رکھتے تھے کہ ''الفاظ بھرے ہوئے پستول ہیں۔ انسان اگر وہ بولتا ہے تو نشانہ لگاتا ہے۔ مگر چونکہ اس نے پستول چلانے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ ضروری ہے کہ اس کا یہ فعل نشانہ باندھتے ہوئے انسان کی طرح ہو نہ کہ بچے کی طرح جو کہ یونہی آنکھیں بند کیے محض دھماکوں سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔'' (۳۹)

میر نصیر خاموش ہونے کی بجائے پورے گھن و گرج کے ساتھ بولتے رہے اور بولتے وقت انہوں نے نہ صرف الفاظ کا استعمال بڑی خوبصورتی اور عمدگی سے کیا۔ بلکہ نہایت ہی جرات اور دیانت کا مظاہرہ کیا۔ میر نصیر بلاشبہ بلوچستان کے جمہور کا

ضمیر، جرات اور آزادی اظہار کی علامت ہیں۔ ان کی آواز جمہور کی آواز ہے۔ ان کی شاعری بلوچستان کی تاریخ ہے۔

''گل خان نصیر کی شاعری، جنگ، جدوجہد اور انقلاب کی شاعری ہے۔ وہ صرف بلوچستان کے شاعر نہیں تھے، وہ پورے پاکستان کے شاعر تھے۔ انہوں نے انسان سے محبت کی، انسان کے دکھوں، اس کی محرومیوں اور اس کے مصائب کا ادارک کیا، انہوں نے زندگی کو ایک ایسے المیے کی صورت میں دیکھا، لیکن ایسے المیے کی صورت میں جسے انسان اپنی انقلاب آفرین جدوجہد کے ذریعے ایک نشاط انگیز منظر میں تبدیل کرسکتا ہے۔'' (۴۰)

میر نصیر کی شاعری میں موضوعات کا پھیلاؤ اتنا وسیع ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے کہ اس نے بلوچستان کی لمحہ بہ لمحہ صورتحال کو اپنے فن کے کینوس میں جگہ دی ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کی کمی نظر آتی ہے نہ ان کے اظہارِ بیان میں کسی قسم کی کجی یا تنگ دامنی کا کوئی احساس جھلکتا ہے۔ واقعات وواردات کو شعری قالب میں ڈھالنے کے لئے ان کے ہاں الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ تھا اور انہیں بلوچی زبان کے مختلف لہجوں پر مکمل دسترس ہونے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری پر عبور حاصل تھا۔ ان کی تکنیک اور زبان کی جڑیں روایتی کلاسیکی شاعری میں پیوست تھیں۔ ''انہوں نے بلوچی شاعری کی قدیم اور کہنہ روایات کو تخلیقی انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے انہیں ایک نیا رنگ اور نئی معنویت عطا کی۔ ان کی شاعری، ہیئت کے قدیم اور مروجہ سانچوں کو اپنانے کے ساتھ معنی آفرینی، جدت طرازی، تنوع اور حقیقت نگاری کا ایک رنگا رنگ مرقع ہے۔

وہ جس عہد میں سانس لیتے تھے، اس عہد کی سچائیوں کو انہوں نے جانا، پرکھا، اپنایا۔ اور پھر انہیں زبردست فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعے دلوں میں اتر جانے والے فن پاروں کی شکل میں پیش کر دیا۔'' (۴۱)

میر نصیر کی شاعری کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ان کا شعری لہجہ اور طرز اسلوب نہایت ہی سادہ اور سہل ہے۔ ان کا فن ایک عام چرواہے کے لیئے اتنا ہی Appealable ہے جتنا کہ ایک پڑھے لکھے کے لئے ہے۔ اس کی شاعری میں ابلاغ اور ترسیل کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی فلسفیانہ پیچدگی اس کی شاعرانہ اظہار میں رکاوٹ بنتا ہے۔ وہ لوگوں کی زبان میں لوگوں سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ ان کے مسائل و مشکلات کی نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں۔ بلکہ ان مسائل و مشکلات پر قابو پانے کے لئے وہ لوگوں کو جدوجہد کے لئے اکساتے ہیں۔

قدم قدم بڑھے چلو
بے خطر چلے چلو
بہ شان مادرِ وطن
مال و جان فدا کرو
بنام ننگ و آبرو
قربان شوریدہ سر کرو
شوق منزل مراد
قدم قدم بڑھے چلو

شب کی تاریکیاں ہوں چار سو

طوفانِ برق و باد ہو

سر پہ ہو قہرِ آسماں زمیں اگلتی آگ ہو

راہ میں ہوں ہزار مشکلیں

زمانہ تیرے خلاف ہو

بے خطر چلے چلو

قدم قدم بڑھے چلو

دستِ جفا کی تیغ سے

کیوں نہ گردنیں کٹیں

عہدِ ستم کی مشکلیں

لاکھ پر غضب بنیں

چلتے رہو دوستو

قدم کہیں رکیں نہیں

اس دشتِ ناسپاس میں

قدم قدم بڑھے چلو

کیوں نہ تفنگ و تیر

تمہارے سروں پہ برس پڑیں

لخت ہوں دل و جگر

کہ دیکھنے کی سکت نہ ہو

رواں ہوں خون کی ندیاں

ہر سو رقصِ مرگ ہو

میدانِ خاک و خون میں

بے خطر چلے چلو

قدم قدم بڑھے چلو

بے حمیت زندگی بھی

کیا زندگی ہے دوستو

اٹھو وطن کے پاسبان

طوقِ غلامی توڑ دو

بلوچ فرزندوں کو

نصیر کا سلام ہو

حق کا علم تھام کر

قدم قدم بڑھے چلو۔ (کدم کدم رواں) (۴۲)

☆

حیدر آباد جیل کسے کھا جائے گا

اور کس کو باہر نگل دے گا

اس کی پرواہ مت کرو

دل شکستہ مت بنو

آگے بڑھتے رہو

پیچھے مڑ کر بالکل نہ دیکھو

منزل پر ہر صورت پہنچنا ہے

اس راہ میں جو پیش آتا ہے

پیش آنے دو

خیال رہے کہ جیل کی زنجیریں اور پھانسی کا پھندا

تمہارے عزم کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے

یہ یقین کرلو کہ، صرف جانثاری میں تمہاری بقا مضمر ہے

یہ چور اور ڈاکو تا ابد قوم کے سر پر مسلط نہیں رہیں گے

جھوٹ اور ظلم کی بنیادوں پر تعمیر کیا ہوا محل

آخر کار ڈھ جاتا ہے۔(سنٹرل جیل حیدر آباد) (۴۳)

☆

آزادی، اپنی مقدس درگاہ پہ

بہادروں سے

نذرانے اور عظیم قربانی مانگتی ہے۔(تریاک لنٹ) (۴۴)

والٹیئر نے کہا تھا کہ ''جب میں قلم اٹھاتا ہوں تو میں حالت جنگ میں ہوتا ہوں۔'' میر نصیر اس قول کے مجسم تصویر تھے۔ان کے فن میں بلا کی تخلیقی قوت، احساس

کی شدت، جذبہ کی تازگی اور توانائی نمایاں ہے۔ان کی شاعری انکار، جرات، ہمت اور حوصلہ کی شاعری ہے۔ان کے اک اک لفظ میں زندہ رہنے اور جدوجہد کرنے کی تڑپ اور امنگ موجزن ہے۔ان کی شاعری میں حیات دوستی اور حیات افروزی کا پیغام بھی ہے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا عزم بھی۔وہ بدترین حالات میں بھی مایوسی کے شکار نہیں ہوتے۔انہیں ایمان کی حد تک یہ یقین ہے کہ آخری فتح کچلے اور پسے ہوئے محکوم اور مظلوم عوام ہی کی ہوگی۔شکست ذلت، پسپائی اور رسوائی استحصالی نظام کا مقدر ٹھہرے گی۔

میر نصیر انسانی جدوجہد آزادی کے بہت بڑے داعی تھے۔انہوں نے تیسری دنیا کی انقلابی اور آزادی کی تحاریک اور جدوجہد کو نہ صرف خوش آمدید کہا ہے۔بلکہ اس سے مظلوم اور محکوم عوام کی لڑائی سمجھ کر اسے اپنا جدوجہد سمجھا ہے۔میر نصیر طبقاتی تضاد اور فرق کو سمجھتے تھے اس لئے وہ پورے بنی نوع انسان کے مظلوم اور محکوم طبقے کو ایک ہی طبقہ گردانتے تھے۔اور استحصالی نظام کے خلاف ان کی لڑائی کو پوری انسانیت کی لڑائی تصور کرتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ سرمایہ داری اور استعماری نظام ہی عالمی انسانی سماج کی تشکیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔مظلوم اور محکوم قوموں کی استحصال کا ذمہ دار ہے۔اس لئے وہ سرمایہ داری نظام کے بدترین مخالف اور دشمن تھے۔انہیں احساس تھا کہ سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کو جڑ سے اکھاڑے بغیر نہ تو عالمی انسانی سماج کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔اور نہ ہی دنیا میں امن، مساوات، برابری اور ہم آہنگی کا تصور پنپ سکتا ہے۔

ہمارے دکھ درد و خستگی کا
یہی مداوا ہے ایک، ساتھی!
کہ ان کی بنیادیں اس زمیں سے
اکھاڑ پھینکیں
یہ بورژوازی ہے ایک طبقہ
سیاہ کاروں کا اس جہاں میں
بس ان کے تابوت میں رفیقو!
اب آخری کیل بڑھ کے ٹھونکو۔ (ھداءَ) (۴۵)

☆

ساتھیو اب آگے بڑھاؤ قدم
نیند آرام کو حرام کرو
انقلاب آج سر پہ آیا ہے
اور ستم کار سامراج، پڑا
خوف سے ایڑیاں رگڑتا ہے
ساتھیو! بے دریغ وار کرو۔ (پنجگی انت ستم) (۴۶)

میر نصیر بنیادی طور پر سوشلسٹ انقلابی نظریات و تصورات سے متاثر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جا بجا روس اور چین کے معاشی اور انقلابی تصورات سمیت ان کی جدو جہد کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اور ان کی انقلابی پروگرام کو بلوچستان کے

مزدوروں، کسانوں، چرواہوں، ماہی گیروں اور کچلے ہوئے عوام کے لئے مشعل راہ سمجھا ہے۔ میر نصیر پرولتاریہ کا اتحاد، جدوجہد اور اس کی فتح مندی پر پختہ یقین رکھتے تھے۔

بس ایک اور حملہ، اک للکار اور
بس اک اور نعرہ، اک دھتکار اور
بس ایک اور مضبوط ٹھوکر لگے
دہل جائیں جس سے پہاڑوں کے دل
جو مضبوط اک اور ٹھوکر لگے
اکھڑ جائے بنیاد سے سامراج
طلوع صبح فتح مندی میں اب
علاماتِ تاخیر باقی نہیں
آگے، آگے بڑھاؤ قدم
دور منزل نظر سے نہیں ہے ابھی۔ (منزل دیرنہ انت) (۴۷)

☆

چار دن اور عیش کر لو تم
آ گئے اب تمہارے آخری دن
آ رہے ہیں تمہیں مٹانے کو
سرخ پرچم کے پرغضب ساتھی

تمہیں نیست و نابود کرنے کو

کس کے باندھی کمر ہے

یاروں نے

بے نوا ہاریوں، مزدوروں نے

تم کو نابود کر کے چھوڑیں گے

اور گھر بار بھی مٹائیں گے۔ (دانشور و سرمایہ دار) (۴۸)

میر نصیر محنت کا استحصال برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک سرمایہ دار وہ پیرا سائیٹ ہے جو محنت کشوں کے خون پر پلتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شاعری میں سرمایہ دار کو جا بجا چور، ڈاکو، رہزن، گدھ، سانپ، درندہ، مکار، لگڑ بھگو، بزدل، مگر مچھ اور ٹھگ کہہ کر اسے پوری انسانیت کا دشمن قرار دیا ہے۔

یہ سامراج کے دلال

عام ہے فتنہ پروری جن کی

ٹینک، طیارے اور بم لے کر

کتنے معصوم بے گناہوں پر

ٹوٹ ایسے پڑے ہیں جیسے

بھوکے لگڑ بھگو ہوں لاشوں پر

ہے وبا سامراج اور اس کے

ہیں یہ دلال کفن کش کی مثال

وہ ہے قاتل، مگر یہ ہیں اس کے
خونین ہاتھوں کے چاٹنے والے
دونوں بے درد دونوں ہیں جلاد
دونوں ہیں لوٹ مار میں مصروف
ایک ہے خون چوسنے والا
ایک، جو ہڈیاں چباتا ہے
ایک کو سرمایہ دار کہتے ہیں
اک ہے جاگیردار کہلاتا
حق میں محنت کشوں کی دنیا کے
ہے نہنگ ایک، ایک کالا ناگ
چاہتا ہے اب انقلاب وطن
ان بڑوں کو بھی سامراج کے ساتھ
اب مٹا دینا چاہیئے، یارو
رہ سکیں زندہ تا کہ محنت کش
گڈریے کا سب ودہقان۔ (سامراج ہوپے) (۴۹)

میر نصیر ایک خاص خطہ زمین سے وابستہ ہونے اور اس کے باسیوں کے دکھ سکھ کا پرچارک ہونے کے باوجود بھی پورے بنی نوع انساں سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ کیوبائی عوام کی لڑائی ہو یا لاطینی امریکہ یا ویتنامی جمہور کی جدوجہد ہو، میر نصیر کی

آواز ان کے ساتھ رہی ہے۔ان کا دل ان کے ساتھ دھڑکتا رہا ہے۔

دلیر و جانثار کیوبائی جمہور کو سلام

کسانوں، محنت کشوں کی جدوجہد کو سلام

آزادی کی اس عہد ساز تاریخ کو سلام

نصیر دل کی گہرائیوں سے تمہیں شاد باد کہتا ہے

جمہور کی فتح کو پائندہ باد کہتا ہے

بلوچی زبان میں تمہیں زندہ باد کہتا ہے۔ (کیوبائی استمان ءسلام) (۵۰)

☆

گیا دور سامراجی بس نزع کی آخری دو چار ہچکیاں ہیں

سپوت افریقا و ایشیاء کے طوفان بن کر مچل رہے ہیں

چین کے صف شکن بہادر

کیوبا و کوریا کے عظیم فرزند

سامراج کی موت بن کر نکل پڑے ہیں

یہ جنگ، محنت کشوں کی جنگ ہے

بلوچ فرزند بھی ان کا ہم سفر ہے

مزدور و محنت کشوں کی فتح

بلوچ فرزندوں کی آدرش ہے

یہ حصار زنداں، یہ کھنکتی زنجیر

نصیر کی سوچ کو کب قید کر سکے ہیں

شب سیاہ ہے

شب دو چند سیاہ ہو اس سے

میری بلا سے

کہ اب سحر بہت قریب آ چلا ہے یارو۔ (من کید و بنداں) (۵۱)

☆

مرحبا! اے ویٹ کونگ

واہ واہ اے ویٹنام

دست بہ دعا ہوں محنت کش تیرے لئے

اے شہیدو، جانثارو! تمہیں میرا سلام

جو لگائے آگ ظلم و استبداد کی

اسی آگ میں جلتا ہے وہی

''چاہ را چاہ در پیش'' ہے

سچ ہے یہ کہاوت بالیقین

کارازرفتہ ہو گیا ہے سامراجیت کا نظام

مشرق سے جلوہ گر ہے

سوشلزم کی صبح حسین

چین و روس کی روشنی سے

جگمگ کر رہی ہے ایشیاء

ہر سو مٹ رہا ہے سامراجیت کا فسوں

اب کام نہ آئے گا

امریکیوں کا مال وزر

اب نہ چلے گی

سامراجیت کی جادوگری

اے دلیرو، جانثارو!

جاں ہتھیلی پہ سجا کر

تم نے بچالی زندگی

ابد تک زندہ رہے گی

تمہاری یہ کہانی، جانثاری دوستو!

زندہ و پائندہ رہے یہ جہدِ بے مثال

زندہ و پائندہ رہے یہ انقلاب حسیں

مردہ باد سامراجیت کا نظام

مردہ باد ظلم و استبداد کا نظام (ویٹنام) (۵۲)

آزات جمالدینی

جدید بلوچی شاعری کی تاریخ میں آزات جمالدینی وہ جدت پسند اور رجحان ساز شاعر ہیں۔ جنہوں نے بلوچی شاعری میں نہ صرف آزاد نظم کو متعارف کرایا بلکہ وہ اسے محسوسات کا ایک نیا پن اور نیا لہجہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ وہ عہد تھا جہاں میر گل خان نصیر سمیت اور بہت سے دوسرے شعراء پابند نظم اور غزل کے وسیلے سے ہی اپنا عہد کے تقاضوں اور وقت کے بدلتے رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے جدید رجحانات وانکشافات کو اپنے فن میں برت رہے تھے۔

یہ عہد چونکہ سماجی اور سیاسی تحرک کی ابتدا کا دور تھا۔ اس لئے مقصدیت اور ادعائیت کے زیر اثر اس دور کی شاعری میں داخلی رخ کی بجائے خارجی عوامل کو نمایاں اہمیت ملی۔ غزل کے مقابلے میں نظم زیادہ نکھر کر سامنے آ گئی۔ سب سے پہلے میر نصیر نے ہی نظم کو اظہار کا وسیلہ بنا لیا۔ اور ۱۹۵۱ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گلبانگ'' جو جدید بلوچی شاعری کا پہلا مجموعہ بھی ہے، منظر عام پر آیا۔ میر نصیر کی شہرت کے دوران ہی آزات جمالدینی نے بھی نظم کا سہارا لیا۔ (۵۳)

لیکن آزات جمالدینی کی شاعری اپنے عہد کے موضوعات سے ہم آہنگ

ہونے کے باجود نظم کی تحریک میں سب سے الگ اسلوب اور لہجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے خارجی زندگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ داخلی احساسات کو بھی نظم میں جگہ دے کر اسے ایک نئی فنی اور معنوی دبازت عطا کی۔

آزات جمالدینی کی ''مستیں توار'' جدید بلوچی شاعری کا دوسری شعری مجموعہ تھی۔ جو ''گلبانگ'' کی اشاعت کے دوسال بعد ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آیا ''مستیں توار'' اپنے لہجہ اور اسلوب کے اعتبار سے ایک نئی آواز تھی۔ جدید بلوچی شاعری میں اس نئی آواز کو خاصی پذیرائی ملی۔ کیونکہ اپنے عہد کے لہجے کے برعکس اس میں ایک قسم کی تازگی، سادگی اور سچائی نمایاں تھی۔ آزات کی شاعری اس کی شخصیت کی طرح سادگی اور سچائی سے بھرپور ہے۔ وہ سیاسی مقصدیت اور عوامی جانب داری کو فنکار کے لیے ایک ضروری امر قرار دیتا ہے۔ اور غالبا اسی ترقی پسندانہ نظریات کی بدولت اس کی شاعری میں یہاں کے لاکھوں مظلوم اور پس ماندہ بلوچوں کے دلوں کی دھڑکنیں پوری شدت سے محسوس کی جاسکتی ہیں۔

حیات و کائنات کے متعلق اس کا نظریہ صاف اور واضح ہے وہ انسان کی عظمت کو کسی ماورائی حقیقت کا پرتو نہیں سمجھتا۔ وہ ہلکی پھلکی بحروں اور عام زبان میں اپنے ماحول کی نہایت چابکدستی سے ترجمانی کرتا چلا جاتا ہے۔ اور انتہائی سچائی اور توانائی سے ایک ایسی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ جہاں دائمی اور عالمگیر محبت ہے۔

آزات کی فنکارانہ صلاحتیں تکنیک اور موضوع کی ہم آہنگی سے ایک ایسا گہرا تاثر پیدا کرتی ہیں کہ شعر سننے والے کا دل اور دماغ متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ

سکتا۔ ''آزات بلوچستان کنیں'' (ہم بلوچستان کو آزاد کریں گے۔) ما امن لوٹیں۔ (ہم امن چاہتے ہیں)۔ اور مستیں توار (للکار) وغیرہ اس قبیل کی کامیاب نظمیں ہیں احساس کی شدت کے باوجود ان نظموں میں بے ہنگم رستخیزی کہیں نہیں ملتی۔ البتہ ایک تفکرانہ شگفتگی ضرور پائی جاتی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں سے کم سے کم مدد لینے کے باوجود اپنے ضمیر کی آواز سے دوسروں کو متاثر کرنے کا ڈھنگ وہ بخوبی جانتا ہے۔

''مستیں توار'' آزات جمالدینی کی ابتدائی شاعری تھی۔ اور اپنے عہد کے غالب طرز احساس سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود نسبتاً ایک نئی ذائقہ کی حامل تھی۔ لیکن آزات جمالدینی اپنی شاعری کے سفر میں برابر ذہنی اور فکری ارتقا سے گزرتے رہے۔ اور آنے والے ادوار میں وہ ایک رجحان ساز شاعر کے طور پر بلوچی شاعری میں اپنے مستقل اثرات مرتب کرنے میں کامیاب رہے۔

آزات جمالدینی کی وفات کے چار سال بعد ۱۹۸۵ء میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''رژن'' شائع ہوا۔ جس میں ''مستیں توار'' کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ ان کے بعد کی شاعری کا ایک قلیل سرمایہ بھی شامل ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ خلیج کے سفر کے دوران ان سے کہیں گم ہوا۔ ''رژن''، مختصر سا شعری مجموعہ ہونے کے باوجود بھی موضوع و مواد اور تکنیک و اسلوب کے اعتبار سے منفرد ذائقہ کی شاعری ہے۔ اور اس میں آزات جمالدینی بجا طور پر خود کو دریافت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

''رژن''، میں ''مستیں توار'' کی بلند آہنگی اور مقصدیت کے جوش کے برعکس

ایک علامتی اور استعاراتی پیرایہ اظہار ملتی ہے۔ ''رژن'' کی چند ایک نظموں کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے فن کی بنیاد وضاحت وصراحت کی بجائے رمزیت اور اشاریت پر قائم کی۔ اور اجتماعی احساس کو بھی انفرادی احساس اور ذاتی وژن کی روشنی میں پیش کیا۔ انار دانگ ،دوشی ،تہنائی ،مہرک ،پرن دوشی دل زہیرواریں ،نہادی ،کشار، مائیکان، التجا، پدریچ اور سمندر تندیں کی نظمیں اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں وہ داخلیت کے وسیلے سے خارجی موضوعات اور ان کے محرکات پر نہایت ہی فنکارانہ طریقے سے اظہار خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آزات جمالدینی بنیادی طور پر ایک انسان دوست شاعر تھے۔ غریب اور محنت کش عوام سے محبت اور دوستی ان کا ایمان تھا۔ وہ ہر قسم کے ظلم وجبر، نابرابری، عدم مساوات اور استحصال کے خلاف تھے۔ انہوں نے ہمیشہ غریب اور مفلوک الحال عوام کی حمایت میں آواز اُٹھایا۔ آزات جمالدینی کا فلسفہ دوستی کسی تحریک کے زیر اثر نہ تھا ،گوکہ وہ ترقی پسند تحریک اور سوشلسٹ نظریات سے متاثر تھے۔ لیکن وہ فطرتاً ایک شاعر اور قلم کار ہونے کے ناتے سے انسان دوستی کے فلسفہ پر یقین رکھتے تھے۔ انسان دوستی ان کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے۔ جہاں وہ وہ بلا کسی رنگ ونسل اور بلا کسی فرق وتفریق کے پوری انسانیت سے محبت کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔

آزات جمالدینی نے انسان کے جس تصور کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے ۔وہ کسی آدرش کے زیر اثر نہیں بلکہ خالصتاً انسانی ہے ان کے نزدیک انسان ایک ہمہ گیر استعارہ ہے۔ وہ اپنے تصور فن کو محدود اور مخصوص نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا تخلیقی شعور

اور ان کا فکری نظام اس کے اسلوب زیست سے جنم لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ آزات جمالدینی کے ہاں اپنے وطن اور اپنی مٹی سے محبت کا جذبہ ان کے نظم ''پیمان'' (عہد) میں بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ وہ اپنے دیس کو سرداروں، نوابوں، جاگیرداروں، وڈیروں اور استحصالی ٹولے کی غلامی کے ظلم وستم سے نجات دلانے کا عزم رکھتے تھے۔

بھیڑوں اور اونٹوں کے ستم زدہ چرواہو
مظلوم اور غریب خانہ بدوشو
مجبور کسانو اور مزدورو
گرسنہ اور برہنہ انسانو
آؤ تا کہ ہم ایک نئی اور خوشحال زندگی کا آغاز کریں۔
کہ ہم اپنے دیس کو آزاد کر کے رہیں گے۔
آؤ تا کہ ان سرداروں
خونخوار اور درندہ صفت نوابوں
کالے ناگوں کی مانند ڈسنے والوں
اور بلوچ قوم کے غداروں کو نہ صرف اپنے قبیلہ سے نکال باہر کریں
بلکہ انہیں زمین کی اُتھاہ گہرائیوں میں دفن کر دیں
ہم وعدہ کرتے ہیں
کہ ہم اپنے دیس کو آزاد کر کے رہیں گے۔ (ترجمہ: انجم قزلباش) (۵۵)

☆

آزات جمالدینی ایک ایسے خوشحال معاشرے پر یقین رکھتے تھے۔ جہاں انصاف، امن روزگار، برابری اور آزادی میسر ہو۔ وہاں کسی قسم کا استحصال اور ظلم نہ ہو۔ کوئی کسی کا محتاج اور غلام نہ ہو۔ وہ محکومی اور غلامی کی زندگی سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ وہ اپنی ایک غزل میں اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ غلاموں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ محبت کی باتیں کریں۔ پیار کی پینگیں بڑھائیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ غلامانہ زندگی اور غلامانہ اقدار کی فضا میں محبت پنپ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ محبت تو انسانی روح آزادی کی علامت ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے ایک بہتر اور ہموار انسانی سماج کی ضرورت ہوتی ہے۔

میری حسیں پیکر محبوبہ!
تو میری زندگی کے ایک ایک لمحہ میں میرے ساتھ رہتی ہے۔
اب عشق و محبت کی اس گفتگو کو ترک کر دے
کیونکہ مفلس اور قلاش غلاموں کو
عشق و محبت کی یہ داستانیں زیب نہیں دیتیں
عشق و محبت کے زیور تو وہی لوگ استعمال کر سکتے ہیں
جو آج خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ (ترجمہ: انجم قزلباش) (۵۶)

آزات جمالدینی جنگ و جدل سے شدید نفرت کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ جنگ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ انسان اور انسانیت کی تباہ و بربادی کی

علامت ہے۔وہ اپنی نظم ''ما امن لوٹیں'' (ہم امن چاہتے ہیں) میں جنگ کی تباہ کاریوں اور اسکی ہولناکیوں پر لعنت بھیجتے ہیں ہوئے کہتے ہیں ۔کہ جنگ کی تباہ کاریوں، ٹینکوں، توپوں اور جنگی جہازوں کی گڑگڑاہٹ کی بجائے ہم اس دھرتی پر امن، خوشحالی اور فرد کی آزادی اور احترام دیکھنا چاہتے ہیں ۔ہم چونکہ انسان ہیں اور انسانیت کے علم بردار ہیں۔اس لیے ہمیں بارود کی زہریلی بو کی بجائے پیار اور محبت کی خوشبو چاہیے۔ہمیں بھوک، افلاس اور غربت کی بجائے ایک روشن اور تابناک مستقبل چاہیئے۔ہمیں زندہ رہنے کے لیے زندگی کی امنگ اور تڑپ چاہیے۔

ہم امن پر حملہ کرنے والے بے حیا چیتوں، بموں، توپوں
اور خونخوار گولیوں سے اپنی بے پناہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔
ہم انسان ہیں اور ہم دائمی امن کے خواہاں ہیں۔
اس لیے ہم جنگ سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔
جنگ زندگی اور قوت کے سرچشموں کو جلا کر ختم کردیتی ہے۔
اور ملک میں نحوست پھیلا کر بے روزگاری، قحط اور افلاس کو جنم دیتی ہے۔
ہم انسان ہیں اور دائمی امن کے خواہاں ہیں۔
اس لیے ہم جنگ سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔
یہ شرارت پسند امریکی اور انگریز سامراج
ظالم وحشی چنگیز کی طرح جنگ کی آگ بھڑکانے پر آمادہ ہیں۔
لیکن ہم انسان ہیں اور دائمی امن کے خواہاں ہیں۔

اس لیے ہم جنگ سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

جو عوام کے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔

دائمی امن کے خواہاں اور زندگی کے محافظ ہیں۔

ہم ان کے ساتھی اور رفیق ہیں۔

ہم انسان ہیں اور دائمی امن کے خواہاں ہیں۔

اس لیے ہم جنگ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

امن زندگی کا سرچشمہ ہے۔

امن تمام دکھ درد اور کلفتوں کا واحد علاج ہے۔

زندگی امن کے دنوں میں پھلتی پھولتی ہے۔

ہم انسان ہیں اور دائمی امن کے خواہاں ہیں۔

اس لیے ہم جنگ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں

معبود نے بھی مقدس قرآن میں

امن کی بے پناہ تعریف کی ہے۔

اور اس لیے ہم بلوچ بھی

جنگ سے نفرت کا اعلان کرتے ہیں۔

کیونکہ ہم انسان ہیں اور دائمی امن کے خواہاں ہیں۔ (ترجمہ: انجم قزلباش) (۵۷)

زندگی اور تہذیب کے سوتوں اور سرچشموں کی جلانے اور نحوست پھیلانے والی انسان کش جنگوں کے بارے میں آزات جمالدینی اور ساحر لدھیانوی کی سوچ

ایک جیسی ہے۔آزات جمالدینی کی طرح ساحر لدھیانوی نے اپنی مشہور نظم ''اے شریف انسانو'' میں اسی احساس کو نہایت ہی فنی چابکدستی اور تخلیقی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر
جنگ مغرب میں ہو یا مشرق میں
امن عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روح تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں میں تلملاتی ہے۔
ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے۔
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے
اس لیے اے شریف انسانو
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں

شمع جلتی رہے تو بہتر ہے۔

آزات جمالدینی کی پوری شاعری ایک ایسے درد مند دل کی پکار ہے ۔جہاں وہ اپنے ماحول اور اپنی گردوپیش کی زبوں حالی ،غربت ، جہالت ،افلاس اور پس ماندگی کو دیکھ کر بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے۔ان کے اندر کا کرب سوا ہوتا ہے۔ان کا دکھ پورے معاشرے کا دکھ ہے۔ان کا کرب پورے عالم کا کرب ہے۔

آزات جمالدینی اپنی نظم ''نہادی'' (نیلامی) میں اپنے لیلائے وطن کی زبوں حالی اور غریب عوام کی بے رنگ اور بے کیف زندگی کے مصائب و مسائل کا تجربہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم مدتوں ظلم وستم کی چکی میں پستے ہوئے چلے آرہے ہیں ۔اور ہمارے مقدر میں جیسے دنیا بھر کی محرومیاں اور تلخیاں لکھ دی گئی ہوں ۔بھوک ،غربت اور افلاس ہماری قسمت ٹھہرادی گئی ہو، ہمارے اجڑے اور ویران گھروں میں سوائے بھوک کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ ہمارے معصوم پھول سے بچے دو وقت کی روٹی کے لیے ترس گئے ہیں۔اور ہم ایک ایسی میراث کے وارث ہیں ۔ جہاں غلامی ۔بھوک اور بیماری کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔وہ کون ہے جو ہماری اس سیہ بخت راتوں کو روشنی سے منور کرے۔

''نہادی'' (نیلامی) اور ''پرندوشی'' (گذشتہ شب) میں اگرچہ آزات جمالدینی اپنے سیدھے سادے اسلوب کے حوالے سے ایک سادہ سی کہانی بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔لیکن اس کہانی کے بنت میں ایک بے حد پیچیدہ اور گنجلک اور درماندہ معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

چلے ہیں ششدر و حیراں

نکل پڑے ہیں

چلو اب ساتھیو عزم سفر کریں

بیچ ڈالیں آباؤ اجداد کی میراث دولت کو

اس سیہ بخت ویراں بے صبح دن کو

بیچ ڈالیں اس خانماں برباد ہستی کو

ان تیرہ بخت سالوں کو مہ و دن کو

کہ ہمارے معصوم پھول سے بچے

منہ بھر نوالے کے لیے ترس گئے ہیں

بیچ ڈالیں سبھی اسباب و ساماں کو

اس لیے ثمر بے کیف گذراں کو

اپنی ھست و نیست کے سارے امکاں کو

اے انسانو! انسانوں کے فرزندو!

کچھ تو قیمت دو

ایک، دو، دس

کیا کوئی ہے جی دار جو خریدنا چاہے

میری زندگی بھر کے اثاثے کو

جو میرا ہی مقدر ہے

نہیں۔۔۔کوئی ایسا نہیں جی دار۔

جو میری اس متاعِ بے ثمر کی کوئی قیمت دے

سراپا کرم خوردہ متاعِ بے قدر کی کوئی قیمت دے (نہادی) (۵۸)

☆

الامان! گذشتہ شب، سیاہ و ویراں شب

چار سو ظلمت کی ویرانی اور میری سیہ بختی

میں اور آسماں

ہم دونوں ایک ویراں شب کے باسی تھے

میں اور آسماں

ہم دونوں ایک جیسے ایک ہی مانند گرفتارِ بلا تھے۔

میں اور آسماں

دونوں ششدر و حیراں

ان کی نظریں مجھ پر جمی تھیں

اور میں نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ رکھی تھی

میں اور آسماں

ہم دونوں کے چہرے پر

رات کی تاریکیاں برستی تھیں

گذشتہ شب

بہت ہی تاریک اور بھیانک تھی
میں نے جانکسل شب کا اک اک لمحہ
آنکھوں میں گذاری تھی
اور بے نور آسماں درد والم سے بلکتا تھا
دور تک ستاروں کا سراغ پا
ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتا تھا۔
ہم دونوں خوف سے جاں بہ لب نیم مردہ تھے
کہ موت ہمارے پاس سے آ کے گذری تھی
میں اور آسماں
نوید صبح کی خاطر سراپا منتظر
آنکھوں میں امید کی شمع جلائے بیٹھے تھے۔
کہ اچانک کہیں سے چودھویں چاند کی مانند
ایک سرخ ستارہ کی روشنی لپکی
آسماں کے چہرے پر ظلمت شب کی پرچھائیاں مٹ گئیں
مگر میرے مقدر میں جو تیرہ شبی لکھی تھی
سو وہ اب بھی ہے
جو ازل سے تھی (پرندوشی)(۵۹)

☆

نہادی کے علاوہ دوشی (شب رفتہ) اور مائیکان (ماہتاب) جیسی نظمیں بھی اسی صورتحال کی آئینہ دار نظمیں ہیں جن میں اجتماعی احساس و کرب کو انفرادی احساس اور ذاتی وژن کی روشنی میں پینٹ کیا گیا ہے۔

گوکہ آزات جمالدینی خود بھی ساری زندگی غم دوراں اور غم روزگار کی تلخیوں کا شکار رہے۔ لیکن اس کی شاعری میں کہیں بھی اپنی ذات کے حوالے سے زمانے کی سختیوں اور مصائب کا گلہ نہیں ملتا۔ وہ جب بھی بات کرتے ہیں تو اس کے فکر کا دائرہ اور ان کی سوچ کا تانا بانا پوری انسانیت کے گرد گھومتا ہے۔ آزات جمالدینی کی شاعری میں ایک امید ہے، رجائیت ہے۔ ایک یقین ہے۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ زمانے کی تلخیوں اور غم و آلام سے خوف زدہ نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمیشہ جدوجہد کی بات کرتے ہیں۔

بلوچستان میں سیاسی جبریت، ظلم و تشدد کی صورتحال نے جس طرح بلوچستان کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی صورتحال کو متاثر کیا۔ اپنے عہد کے شعراء نے اس کے اثرات کو جا بجا اپنی شاعری میں سمیٹ لیا۔ آزات جمالدینی کے ہاں بھی اس جبر اور دباؤ کی واضح تصویریں نظر آتی ہیں۔ ''پدریچ'' (نسلِ نو) میں وہ نوجوانوں سے مخاطب ہوکر اپنے عہد کا سانحہ پیش کرتے ہیں۔

ہماری یاد کو قرآن کی صورت بچا رکھنا / کہ ہم نے جبر کی کالی سیاہ راتیں / کھلے آکاش کے نیچے گزاریں / کرب میں بھوکے پیاسے، کسمپرسی میں / تو سحر نکھری / اسی امید پہ ہم نے ستم کا راستہ روکا / ہمارے نوجوان کل / یاد رکھیں گے جلانا /

یادکی مشعل/ چراغ راہ/ جوانان حسین صبح یقین/ اپنے لہو سے شہر، گلیاں، بستیاں کہسار / ہم گلنار کرتے گئے/ اگر تم جاننا چاہو/ تو دیکھو خونچکاں تاریخ کے ابواب زریں کو/ پڑھو، دیکھو/ جوانو، ساتھیو/ کل تم ہماری یاد کے دیپک جلانا/ بھول نہ جانا/ کہ ہم نے زہد کے ہر سلسلے کی انتہا کردی/ آزادی کی راہ پر خار میں کیا کیا/ ستم سہنے، جبر سہنے کی/ ہم نے انتہا کردی/ کیا تم جانتے ہو اور سمجھتے ہو!/ درندوں نے ہمیں نوچا/ قفس میں زندگی ریزہ ہوئی/ ہم نے نہ کیا کیا سختیاں جھیلیں/ تمہارے ہی لئے پیارو/ تمہارے واسطے بیٹو / بلا کی جراتیں/ اٹھتی امنگیں دار کی ٹہنی پہ واری گئیں/ جوانان حسیں صبح یقین/ اس خون کی رنگت سے/ جو برسا بے مہابا خشک/ بے آب و گیاہ دھرتی کے سینے پر/ گواڑگ کے حسیں پھولوں پر جوبن ہے/ جو شہروں، بستیوں/ بے انت پھیلے/ دشت میداں میں/ پہاڑوں، کوہساروں پر/ صبا کے سنگ جھولے جھولتے ہیں بے نیازی سے/ جوانان حسیں صبح یقین!/ وہ داغ دکھلادوں۔۔۔۔؟/ لگے جو دامن دل پر/ تمہارے واسطے اپنے جواں ساتھی/ سمندر پار/ ہاں اغیار میں پردیس بھی لد گئے/ جوانانِ حسیں صبح یقیں!/ سنبھال کر رکھنا/ ہماری یاد کے رشتے/ امر سے پیار کے ناتے/ میرے پیارے، حسیں فردا کے شہزادے/ اسے دیکھو/ مگر باریک بینی سے/ میرا۔۔۔ میرا پیغام ہے یارو/ اسے محفوظ رکھنا جان سے بڑھ کر/ میری تابندہ امیدوں کی نسل نو قرباں کر گئے/ خود فدا ہو گئے/ بڑے جی دار بھائی تھے/ میرے پیارو/ تمہاری پر مسرت، کیف آگیں/ زندگی خود ہی گواہی ہے/ ان دکھوں کی/ جہد کی/ جبر مسلسل کی/ جو ہم سہتے رہے پیارو/ نگار صبح کی خاطر۔ جو تمہارے بام و در پہ چھلکتی ہے/ تمہیں مدہوش کرتی ہے/ میری

تابندہ امیدوں کی نسل نو (ترجمہ: اللہ بشک بزدار)(۵۹)ب

اس نظم میں آزات جمالدینی نے جس خوبصورتی اور گہرائی و گیرائی سے اپنے عہد کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی نقشہ کھینچا ہے۔ اور جس انداز سے انہوں نے مصائب و مسائل، خارجی دباؤ، جبر و استحصال سمیت اپنی لازوال قربانیوں، جذبوں، امنگوں اور کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستاں رقم کی ہے۔ جو محض بلوچ معاشرے کی بیکسی و بے بسی کا نوحہ ہی نہیں بلکہ ان کی بے توقیری، بے وقعتی اور بے شرفی کا وہ المیہ بھی ہے۔ جہاں پورا بلوچستان درد و الم اور اندوہ و غم کا ایک مضمحل چہرے لئے نظر آتا ہے۔

آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد ملک کے عوام یہ سمجھ رہے تھے کہ اب ظلم و ستم کی سیاہ رات ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر رہے گی۔ بھوک، غربت، جہالت، افلاس غلامی اور استحصال سے نجات ملے گی۔ نام نہاد سرداروں، نوابوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی بجائے عوام مسندِ وقت پر بیٹھیں گے۔ استحصالی ٹولے کے تاج و تخت گرائے جائیں گے۔ وطن عزیز میں امن، انصاف اور مساوات کی حکمرانی ہوگی۔ لیکن یہ تمام خواہشیں اور آرزوئیں نہ صرف سراب ثابت ہوئیں بلکہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ غربت، جہالت، پس ماندگی اور درماندگی کے سائے مزید گہرے ہوتے گئے۔ نوکر شاہی اور جاگیرداروں کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی گئی۔ انگریزوں کے پالے ہوئے سردار، نواب اور جاگیردار فراعنہ وقت کا روپ دھارتے گئے۔ خدا کی سرزمین پر خلقِ خدا کی زندگی تنگ کر دی گئی۔ آزات

جمالدینی جیسا حساس شاعر ایسے حالات میں کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ انہوں نے اس صورتحال کے حوالے سے اپنی نظم ''من باور چون کنیں'' (میں کیسے یقین کرلوں) میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

دھرتی سے آکاش تک آندھیاں اور تاریکیاں مسلط ہیں
جنتا کے چہرے افسردہ اور گریباں تار تار ہیں
ہمارے دن، راتوں سے بھی تاریک تر ہیں
اور ہماری راتوں کا کیا پوچھتے ہو (ان بھیانک دنوں اور راتوں ہی سے ہماری خستہ حالی کا اندازہ لگالو)
میں کیسے یقین کرلوں کہ ہم آزاد ہیں؟
وزراء، افسر اور جاگیردار آپس میں شیر وشکر ہیں
یہ غریبوں کو لوٹ کر دادِ عیش دے رہے ہیں
یہ انسانیت کا خون پینے والے سمگلنگ کرتے ہیں
اور اسے تجارت کا نام دیتے ہیں
عوام خاک پھانکیں یا زہریلی جھاڑیاں کھائیں
انہیں اس کی پرواہ نہیں
میں کیسے یقین کرلوں کہ ہم آزاد ہیں؟
وہی بوسیدہ اور پرانا انگریزی قانون ہے وہی جرگہ ہے
جاگیرداروں اور سرداروں کے وہی پرانے طور طریقے ہیں

جب غریب امیر کو دیکھتا ہے تو اس کا دل کانپ جاتا ہے

تمہارا کل مومن اخوۃ کا وہ نعرہ کہاں گیا

میں کیسے یقین کرلوں کہ ہم آزاد ہیں؟

(ترجمہ: انجم قزلباش)(۴۰)

آزات جمالدینی ہی کی طرح فیض احمد فیض نے صبح آزادی کی صورتحال کو خوابوں، خواہشوں اور آرزوں کی نامکمل تصور قرار دیکر اسے ''داغ داغ اجالا'' سے تشبیہ دی تھی۔ ان کے نزدیک آزادی کے جس تصور کو کروڑوں افتادگان خاک نے مل کر حقیقت کا روپ دیا تھا۔ اسے طالع آزماؤں نے لوٹ کھسوٹ، جبر و استحصال، ناانصافی اور عدم مساوات کی بدولت داغدار کرلیا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں ۔
یہ وہ سحر تو نہیں کہ جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
---- کہاں سے آئی نگار صبا، کدھر کو گئی ۔
ابھی چراغ سرراہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔ (فیض احمد فیض)

وطن عزیز میں استحصالی ٹولے نے اپنے ہر عمل کو (Legtimise) کرنے کے لیے مختلف حیلے حربوں سے لوگوں کو خاموش رہنے اور صبر کرنے کی تلقین کی۔ ''انما المومنین اخوۃً'' کے مقدس اسلامی احکام کے نام پر غریب عوام کے حقوق کی نفی کی گئی۔ حالانکہ اخوان ہونے کا تصور تو ''اذ ھبتُکم بنعمتہا خواناً'' میں مغمر ہے۔ یعنی صحیح میں مومن تب ہی اخوان ہو سکتے ہیں، جب وہ تمام نعمتوں اور آسائشوں سے یکساں طور پر بہرہ مند ہوں۔

استحصالی طبقہ نے بادشاہ وقت کی اطاعت شعاری، فرمانبرداری اور صبر و شکر جیسے مذہبی احکامات کی پرچار اور تبلیغ کی۔ جس کا مقصد صرف اور صرف لوگوں کو اپنے مسائل اور حقوق کے بارے میں سوچ و بچار اور غور و فکر سے محروم رکھنا تھا۔ انہوں نے عدم مساوات۔ ظلم و ناانصافی اور طبقاتی جبر کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے اور استحصال سے پاک سماج بنانے کی ترغیب دینے والے زریں اسلامی اصولوں کو دیدہ و دانستہ طور پر عوام سے دور رکھا۔ اور عوام کی حمایت میں اٹھنے والی ہر آواز کو سختی سے دبایا گیا۔

آزات جمالدینی بھی ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کی طرح غیر منصفانہ معاشی نظام کو ہی استحصال کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اور وہ ایک ایسی غیر استحصال اور غیر طبقاتی سماج کی تشکیل چاہتے تھے۔ جہاں کسی قسم کا استحصال نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے اپنی شاعری میں جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی مذمت کی اور کچلے ہوئے طبقات کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی۔ ان کی نظم ''پوریا گر'' (مزدور) جو محنت اور سرمایہ کی جنگ کا رزمیہ ہے۔ انہوں نے اس میں نہ صرف سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان

طبقاتی کشمکش اور تضاد کو اجاگر کیا ہے۔ بلکہ وہ کچلے ہوئے طبقات کو ایک نئی قوت ،استقامت اور حوصلہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جب ہم تیرے متعلق سوچتے ہیں
تو آنسوؤں کا سیلاب
آنکھوں کی راہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔
اور پھر ہماری مسرتیں ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔
تیری غربت اور افلاس حساس دلوں کے لیے ایک شعلہ ہے
جب تجھ پر نظر پڑتی ہے
تو جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور دل رنجیدہ ہو جاتا ہے۔
اور پھر پہلو میں ایک ناسور جنم لیتا ہے۔
جس سے خون اور پیپ رسنے لگتی ہے۔
تیری غربت اور افلاس
حساس دلوں کے لیے ایک شعلہ ہے۔
تو برہنہ جسم کے ساتھ
چلچلاتی دھوپ میں بیلچہ سے کام کرتا ہے
خشک حلق، پیاسا اور بھوکا
تیری یہ زبوں حالی ہمیں رنجیدہ خاطر بنا دیتی ہے۔
تیری غربت اور افلاس

حساس دلوں کے لیے ایک شعلہ ہے۔

یہ احمریں شراب اور یہ لذیذ کباب

جنہیں عالیجاہ نوش فرماتے ہیں۔

تیرا خون اور گوشت ہیں۔ لیکن تیرے

پیٹ میں چوہے دوڑتے ہیں۔

آہ! تیری غربت اور افلاس

حساس دلوں کے لیے ایک شعلہ ہے۔

خاموشی اور خوف کو چھوڑ دے

اب طیش میں آ

جاگیردار اور اس کی نسل کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے

زار روس کا قصہ پھر دہرا۔

تیری مجبوریوں کا علاج یہ ہے

کہ تو دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دے۔

(ترجمہ: انجم قزلباش)(٦١)

ایک رجحان ساز شاعر ہونے کے حوالے سے جدید بلوچی شاعری پر آزات جمالدینی کے احسانات تو ہیں ہی۔ لیکن آزات جمالدینی کا سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ بلوچی ادب کے حوالے سے پچھلے پچاس سالوں میں جو کچھ تخلیق کیا گیا ہے۔ اور جو کچھ تخلیق ہو رہا ہے۔ ان تمام تخلیقات کے خمیر میں انہی کا خون جگر

شامل ہے ،جنہوں نے بڑا ادب تخلیق کرنے کے امکانات کے لیے یہ ادراک کرلیا تھا کہ زبان کو بڑی بنائے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ ''مارکیز'' کی طرح اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ''کوئی ادب بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا، بلکہ یہ زبان ہی ہوتی ہے۔ جو ادب کو چھوٹا یا بڑا بناتا ہے''

اس لیے انہوں نے بلوچی زبان کی ترقی وترویج کے لیے ۱۹۵۶ء میں کراچی سے ''بلوچی'' کے نام سے ایک ماہنامہ کا اجرا کیا۔ اور اسی ماہنامہ کی بدولت چند ہی برسوں میں بلوچ قلم کاروں کا ایک کارواں وجود میں آیا۔

آزات جمالدینی کو بلوچی زبان سے اس حد تک محبت تھی کہ ''ماہنامہ بلوچی ''ستمبر ۱۹۸۱ء کا آخری اداریہ انہوں نے بستر مرگ سے Dictate کروایا تھا، جو نہ صرف بلوچی زبان سے ان کی محبت کا والہانہ اظہار یہ ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہے۔ اور چراغ راہ بھی۔

سید ظہور شاہ ہاشمی

میر گل خان نصیر کی طرح سید ظہور شاہ ہاشمی بھی ایک ایسے ہمہ جہت اور انتھک شخصیت کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بلوچی زبان کی آبیاری اور فروغ وترقی میں گذار دیا۔ بلوچی شاعری ہو یا افسانہ، ناول ہو یا انشائیہ، بلوچی زبان پر تحقیقی کام ہو یا بلوچی لسانیات کی بات ہو۔ سید ہاشمی ادب کے ہر مورچہ میں ایک جنگجو ادیب کی طرح کھڑا نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ایک تحریک تھے۔ وہ انتہائی بے سروسامانی اور ہزار تنگ دامانیوں کے باوجود اپنی زندگی کی آخری سانس تک بلوچی زبان وادب کے ہر محاذ پر ڈٹا رہا۔ اور بیک وقت کئی اصناف سخن پر کام کرنے اور ڈھیر سارے موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کے باوجود وہ ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

ان کے شائع شدہ تخلیقات میں پانچ شعری مجموعے، ''برتگیں بیر ۱۹۶۲ء''، ''انگرو ترونگل ۱۹۶۲ء''، ''تراپکنیں ترمپ ۱۹۶۵ء''، ''سچکانیں سسا ۱۹۸۵ء'' اور ''شکئیں شہجو ۱۹۸۸ء'' کے علاوہ نثری تحریریں ستگیں دستونک ۱۹۵۷ء، بلوچی زبان وادب کی تاریخ ۱۹۸۶ء، بلوچی رسم الخط اور املاء کے بارے میں ان کی کتاب ''بلوچی سیاھگ ءِراست نبسیگ'' بلوچی افسانوں اور انشائیہ مضامین ''میر گند'' ایک مختصر بلوچی ناول ''نازک ۱۹۷۶ء''، قرآن پاک کے آخری پارے کا ترجمہ ''جزعم ۱۹۶۲ء''، ان کے خطوط کا مجموعہ ''سید نمدی ۱۹۹۳ء'' سمیت ان کا اہم ترین کام ''سید گنج ۲۰۰۰ء'' (بلوچی لغت) قابل ذکر ہیں۔

شاعری کے حوالے سے وہ سب سے جدا اور الگ اسلوب کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں شعوری طور پر خالص بلوچی زبان و بیان اور علامات و تشبیہات سے کام لیا۔ اور بلوچی شعری مزاج کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنالیا۔ (۶۲)

انہوں نے اپنی شاعری میں تکنیک اور الفاظ و تراکیب کے حوالے سے ایک نئے رجحان کو فروغ دیا۔ اور بلوچی زبان کے قدیم اور متروک الفاظ کی بازیافت سمیت ان کے استعمال پر زیادہ توجہ دی۔ (۶۳) جس سے ان کی شاعری کی زبان کہیں ایک مقام پر مشکل اور سپاٹ نظر آتی ہے۔

لیکن ان کے اس مشکل پسندی کے باوجود ان کی شاعری کو عوام میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کی شاعری زیادہ تر ان کی محبوب ''ہانل''، اپنی سرزمین، زبان، تہذیب و ثقافت اور بلوچی روایت و اقدار کی بازیافت جیسے موضوعات سے عبارت ہے۔

سید ہاشمی نے نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کی آبیاری اور ترقی و ترویج میں ان کا عمل دخل اور حصہ سب سے زیادہ اور نمایاں ہے۔ اور بجا طور پر ان کی غزل بلوچی شاعری کی تاریخ میں ایک نئے موڑ کا درجہ رکھتی ہے۔ صبا دشتیاری ان کے غزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''سید کی غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کلاسیکی لسانی روایت اور نئے تقاضوں کو اس طرح سے ہم آہنگ کیا ہے کہ جہاں ایک طرف زبان و بیان اور دوسری طرف سوچ اور فکر کے کینوس میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوئی۔ آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں کہ سید کی شاعری میں زبان کی کلاسیکی خوشبو اور ذائقہ بھی ہے اور غزل کے تمام تر لوازمات اور نئے تقاضے بھی ہیں۔'' (۶۴)

بلوچی ادب پر سید کا بڑا احسان یہی ہے کہ انہوں نے بلوچی غزل کو ایک ایسا ڈکشن دیا کہ جہاں کلاسیکی علامتوں کو جدید تقاضوں کا حوالہ بنا کر انہیں ایک نئی معنویت ملی ہے۔ سید کی غزل فنی اعتبار سے غنائیت سے بھرپور ایک سریلے اور دلکش لہجہ اور اسلوب کا حامل ہے۔ اس طرح سید کی غزل بلوچی شاعری کا ایک ایسا ناگزیر سرمایہ ہے کہ جس کے بغیر بلوچی شاعری کی تاریخ نامکمل اور ادھورا ہے۔ (۶۵)

''ہانل''، یعنی محبوب کے حوالے سے سید ہاشمی کی غزل میں رومانیت بھی ہے اور اجتماع کے حوالے سے معاشرتی اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس بھی۔ اور یہی دو چیزیں ان کی غزل کا فکری سرچشمہ ہیں۔ جہاں یہ کئی رنگوں میں ڈھل کر غزل کے کینوس میں پیوست نظر آتی ہیں۔

''سید ہاشمی کی غزل کا فکری سرچشمہ وہی انسانی محسوسات ہیں جو کہ غزل کی روایت سے وابستہ ہیں۔ اور اسی اعتبار سے ان کی غزل فارسی کے حافظ شیرازی اور اردو کے غالب کا ہم پلہ نظر آتی ہے۔ مگر دو چیزیں ان کی شاعری کا بنیادی فکری منبع ہیں اور انہی دو چیزوں کو انہوں نے کئی رنگوں میں پینٹ کر کے اپنی غزل کے کینوس میں جگہ دی ہے۔ ایک ان کا ''ہانل'' (محبوبہ) ہے اور دوسری ان کی قوم ہے۔'' (٦٦) مگر کبھی کبھار یہ دونوں چیزیں یا سطحیں آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں محسوسات ایک ہی سچائی کے دو پہلو ہیں۔

اسی ضمن میں یہاں ان کی غزلوں کے چند اقتسابات ملاحظہ کیجئے۔

؎ کبھی ہانل کے لئے شعر لکھتا ہوں
کبھی قوم کے دکھوں کی بات کرتا ہوں۔ (٦٧)

☆

؎ چھن گیا ہے مجھ سے میرا ہانل اور ہانل کی سرزمیں
دلِ صد شکستہ کو کس طرح سنبھالوں میں
زیست و مرگ کی دیوی مجھ سے خائف ہے
کس سے التجا کروں کس کو عرض گذاروں میں۔ (٦٨)

☆

؎ تم خوب جانتے ہو اے میری سندر سرزمیں

کہ تیرے لئے مضطرب دل تڑپتے ہیں
سید کے یہ آتشیں اشعار
دلِ بریاں کا اظہار ہی تو ہیں۔ (۴۹)

☆

گل اور گلزمیں خواہ آباد ہوں کہ برباد ہوں
مگر مجھ کو دونوں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ (۷۰)

☆

اپنی محبوب سرزمین کے بغیر
میں کسی انتظار کا منتظر نہیں ہوں۔(۷۱)

اپنی ذاتی اور شخصی مفہوم کے اظہار کے حوالے سے سید ہاشمی کے شاعری کا تانا بانا اپنی محبوبہ (ہانل) کے گرد بنتا نظر آتا ہے۔اور انہوں نے اپنی شاعری میں جا بجا اس کرب کا اظہار کیا ہے۔لیکن انہوں نے اپنی اس انفرادی کرب کے ساتھ ساتھ اجتماع کے کرب کو بھی بڑی شدت اور خلوص کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ان کے اس سماجی اور معاشرتی مفہوم میں اپنی زمین اور زمین زادوں کا دکھ بہت ہی توانا اور نمایاں ہے۔سید ہاشمی نے اپنے عہد کی جذباتی اسلوب سے ہٹ کر اپنے عہد کے سانحہ کو ایک علامتی پیرایہ اظہار عطا کی ہے۔

تھور و سیم زدہ ہوں سوختہ مرغزار ہوں میں
پائمال کشت ہوں خزاں رسیدہ بہار ہوں میں
دوستوں کا سہارا ہوں نہ دشمنوں کے لئے خطرہ ہوں

جدا دستہ سے ٹوٹی ہوئی تلوار ہوں میں

روٹی کے چند ٹکڑوں کی خاطر رہن ہے زندگی میری

تم قصوروار نہیں ہو خود اپنا قصوروار ہوں میں

چھن گیا مجھ سے میرا گلستان اور میں ہی مجرم ہوں

اور عجب یہ فلسفہ ہے کہ کیوں سوگوار ہوں میں

سوختہ کشت ہوں، کہاں سے بہار آئے

کہ اپنی ہی آگ کا جلا ریگزار ہوں میں

قوم کے غم میں اپنا جگر جلتا ہے

خواہش نارسا کے غم میں سوگوار ہوں میں

عمر گذری ہو جس کی گیدڑوں کی صحبت میں

وہ کمر خمیدہ شیرِ ناہنجار ہوں میں

چشمہِ فیض کے طلب میں پتھرا گئی آنکھیں

دیوانہ ہوں کہ چشمہ بے آب کا طلبگار ہوں میں۔

(جاور) (۷۲)

سید ہاشمی کی قومی شاعری میں قوم دوستی، وطن دوستی ایک ایسے پختہ فکر و شعور کا حامل ہے کہ وہ انقلاب کی سرحدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جہاں پھر سید کے دلکش لب و لہجے میں نہ صرف یقین بلکہ ہر طرف سحر کی روشنی لپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا وطن دوستی ان کے شوریدہ سر کو ایک استقامت عطا کرتی ہے۔'' (۷۳)

اپنے در و دیوار کو بھولنا ممکن نہیں
ہم سفر ہم نفس یاروں کو بھولنا ممکن نہیں
اک بجلی کی چمک کی دیر ہے اور بس
مچلتے طوفانوں کا بھولنا ممکن نہیں
قدم قدم پر ہر چوک چوراہے پر
ماضی کی حسیں یادگاروں کو بھولنا ممکن نہیں
پرواز میں طائر مریں زبان سوکھ کے کانٹا بنے
موت کے سرکش ریگزاروں کو بھولنا ممکن نہیں
ایک ہی وار میں سر تن سے جدا ہو
چمکتی تیز تلواروں کا بھولنا ممکن نہیں۔

(شمشکارنہ باں) (۷۴)

سید ہاشمی کی غزل کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ ان میں وحدتِ تاثر پایا جاتا ہے۔ ''اگر ایک شعر میں غم اور دوسرے میں خوشی کا اظہار ہو تو غزل بدنما لگتی ہے۔ وحدتِ تاثر کے حوالے سے سید کی غزل کی نظیر نہیں ملتی کیونکہ ان کی غزل میں موضوعاتی وحدت اور شعری رچاؤ نظر آتی ہے۔'' (۷۵)

سید کی بعض غزلوں بالخصوص ''شکلیں شبو'' کی غزلوں میں الفاظ کا ایک ایسا تکرار نظر آتا ہے۔ جس سے نہ صرف الفاظ کا ایک خاص قسم کا پیٹرن وجود میں آتا ہے۔ بلکہ انہی الفاظ کے زیر و بم سے ایک خاص قسم کا (Sound effect) بھی سامنے آتا ہے۔

مراد ساحر

بلوچی غزل کے حوالے سے مراد ساحر کا نام ایک ایسا معتبر اور منفرد حوالہ ہے کہ جنہوں نے ملنگ شاہ ہاشمی سے لیکر عصر حاضر تک کے مختلف ذائقوں اور لہجوں کو سمیٹتے ہوئے نہ صرف غزل کے پیرایہ اظہار کو روایت اور جدت کے حسیں امتزاج سے ایک نئی صورت عطا کی بلکہ نئی شعری زبان اور الفاظ و تراکیب کا جو نیا سینٹکس (Syntax) انہوں نے وضع کیا۔ اس سے احساسات و جذبات کے نئے دریچے وا ہونے کے ساتھ ساتھ تجربات وواردات کے نئے امکانات بھی سامنے آئے۔

مراد ساحر سے پہلے اگر چہ محمد حسین عنقا اور سید ظہور شاہ ہاشمی نے کسی حد تک غزل کی عمومی مزاج اور روایتی روش سے ہٹ کر اسے ایک نئے تصورات و موضوعات سے آشنا کیا تو دوسری طرف فارسی الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات اور طرز خیال و اظہار کے برعکس اسے بلوچی شعری فکر و مزاج سے ہمکنار کیا۔ لیکن مراد ساحر نے حقیقی معنوں میں غزل کی ایمائیت و رمزیت کے روایتی پیراہن اور اس کے عمومی

مزاج کو مسترد کرتے ہوئے اسے نئی مقصدی موضوعات سے آشنا کیا۔ اور اسے جسم اور اس کے لوازم کے تنگنائے سے نکال کر اس کے موضوعاتی دائرہ کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

جدید حسیت کے ساتھ جدید تقاضوں کو اپنے فن میں سمونے کے باعث مراد ساحر کے ہاں غزل ایک نئی موڑ لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مراد ساحر کی تخلیقی شخصیت کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے فنی سفر کے آغاز ۱۹۵۶ء سے لے کر اپنی وفات ۱۹۹۸ء تک تواتر اور تسلسل کے ساتھ غزل لکھتے رہے۔ لیکن بیالیس برسوں پر محیط اپنے فنی سفر میں وہ نہ کبھی جمود کے شکار ہوئے اور نہ ہی یکسانیت ان کے فن پر غلبہ پا سکی۔ بلکہ وہ برابر ذہنی اور فکری ارتقاء سے گذرتے رہے۔

مجموعی طور پر ان کے تین شعری مجموعے ''پاہار ۱۹۷۰ء''، ''چیہال ۱۹۸۷ء'' اور زرعِ مروارد ۱۹۹۵ء شائع ہوئے ہیں۔ ان تینوں مجموعوں میں انہوں نے عصری حقائق کو اپنے فن کا موضوع بنا کر اپنی تخلیقی آگہی اور فنی بصیرت کا ثبوت مہیا کیا ہے۔

مراد ساحر غزل کی روایتی رومانیت سے متاثر ضرور ہیں مگر ان کی غزلوں میں رومان سے زیادہ زندگی کے حقائق کا عکس نمایاں ہے۔ مراد ساحر ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ اور ان کی شاعری میں جا بجا ترقی پسند نظریے کا واضح ادارک اور شعور نمایاں ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے عہد کے مسائل اور معاشرے کے عمومی غم کو سیاسی نعرہ یا مسلکی پروپگنڈہ بنانے کی بجائے غزل کے مزاج کا اہم ترین عنصر بنا کر اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

مراد ساحر کی غزل کا موضوعاتی دائرہ نہایت ہی وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ عصری حقائق اور معاشرتی مسائل کے اظہار کے حوالے سے دوسرے بلوچ شعراء سے شاید کہیں زیادہ انہوں نے اپنے عہد کی صورتحال کو اپنے فن میں جگہ دی ہے۔ جس سے ان کی غزل اپنے عہد کی مکمل تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

فنی اعتبار سے مراد ساحر کی غزل ایک موڈ کی غزلیں ہیں۔ جہاں پر غزل کا ہر شعر موضوع کی کڑیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے احساس و جذبات کو ایک زنجیر میں ڈھال دیتے ہیں۔ اور ان کا فکری نقطہ نگاہ احساس و جذبات کے مختلف شکلوں کے اظہار کے برعکس ایک اکائی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ان کی غزلیں مختلف محسوسات کا مجموعہ ہونے کی بجائے ایک مکمل جذبہ و فکر کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مراد ساحر کی شاعری میں بلوچستان اور اس کے باسیوں کا دکھ، اپنی ثقافتی اور تہذیبی جڑوں کی تلاش و پہچان، عہد کے بدلتے تقاضوں کا احساس اور تبدیلی کے خواہش کا اظہار نمایاں ہے۔ انہوں نے بلوچستان کے مفلوک الحال عوام کی محرومیوں اور تلخیوں کو اتنی شدت، دیانت اور خلوص سے پیش کیا ہے کہ ان کے ہاں معاشرے کا عمومی کرب بھی ان کی ذاتی اور شخصی کرب میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مراد ساحر بلوچستان کے محنت کشوں، مزدوروں، کاشتکاروں اور مفلوک الحال لوگوں کا شاعر ہے۔ وہ انتہائی سادہ، آسان اور سہل انداز میں ان سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اور ان کے مسائل و مشکلات اور ان کے دکھ سکھ کی بات کرتے ہیں۔ ان کے گفتگو کا یہی سادہ مگر انتہائی موثر لب ولہجہ نہ صرف انہیں ان کے عہد کے دوسرے

شاعروں سے ممیز وممتاز کرتا ہے بلکہ اپنے اندر ایک گہرا احساساتی تناظر بھی رکھتا ہے۔

مراد ساحر کی شاعری ''ٹریڈ یونین'' ادب کی تخلیق کے برعکس محنت کشوں کے اوران کی ذہنی کیفیت کا مانوس پیرایہ اظہار ہے۔

ہر طرف غضب کی قحط پڑی ہے
میرے وطن کا حال کیا ہوگا
بھوک سے نڈھال جنم زادوں کا
نہ جانے اب کے حال کیا ہوگا۔ (۷۶)

☆

بھوک غریبوں کا مقدر، خوشحالی امیروں کے لئے
کب تلک یہ سلسلہ یونہی رہے گا
وہ حق بھی چھین لے اور ظلم بھی ہم پہ کرے
کب تک یہ معاملہ یونہی رہے گا۔ (۷۷)

☆

ہڈیاں گل سڑ گئی ہیں روز وشب کی محنت سے
محنت کشوں کی محنت کا حساب غائب ہے
زندگی کا حسیں، روشن خواب غائب ہے
گلستانِ محبت کا رنگ شباب غائب ہے۔ (۷۸)

☆

؎ آ غم کے کوہ گراں کو کاٹ ڈالیں
کدال تم اٹھاؤ اور تیشہ مجھے دو۔ (۷۹)

☆

؎ بھوک مٹتی نہیں چند ٹکڑوں سے
آ کہ کاسۂ گدائی توڑ ڈالیں ہم۔ (۸۰)

؎ وہی مالک ہے یاں سب آسائشوں کی
کہ جس نے کبھی کام کیا ہی نہیں۔ (۸۱)

غزل کی عمومی مزاج کے برعکس ان کے ہاں امید، رجائیت، یقین واعتماد دیکھنے میں ملتا ہے۔ان کی غزلوں میں ناامیدی، مایوسی، دل شکستگی و بیزاری کے برعکس نامساعد حالات کے خلاف سینہ سپر ہونے کا جذبہ نمایاں ہے۔ان کی شاعری میں کہیں بھی بے بسی، بے چارگی اور کمزوری کے احساسات کا دخل نہیں بلکہ ان کے ہاں ظلم و جبر اور نا انصافی کی اساس پر قائم فرسودہ اور بوسیدہ استحصالی نظام کو بدلنے اور اس کی جگہ ایک غیر طبقاتی اور غیر استحصالی سماج کی تخلیق کا خواہش نمایاں ہے۔

؎ تمیز نیک و بد کی ضرورت ہے
اک انقلاب کی ضرورت ہے
سرتاپا کریہہ زندگی کے لئے
اک حسیں خواب کی ضرورت ہے (۸۲)

☆

میرے قتل کے بعد یوں شاداں وفرحاں مت رہو
ممکن ہے کہ میرے خون سے کوئی طوفان بپھر اٹھے۔ (۸۳)

☆

کیا غم ہے کہ آج بنجر ہیں تیرے سبزہ زار
دن بہ دن کمہلا رہے ہیں تیرے مرغزار
کیا ہوا کہ آج خزاں رسیدہ ہے تیرا دیار
غم کے دن تھوڑے ہیں میری جاں بہت تھوڑے ہیں
دور بدلے گا، دلدر سارے مٹ جائیں گے
بہت جلد سیلاب سے بھوک و پیاس کے ٹیلے بہہ جائیں گے
صدیوں کے غمزدہ لوگ پھر سے جی اٹھیں گے
غم کے دن تھوڑے ہیں میری جاں بہت تھوڑے ہیں۔
(کمیں روچ انت) (۸۲)

زندگی پہ جبر کا کتنا ہی کڑا پہرہ کیوں نہ ہو۔ ہر طرف خوف کے مہیب سائے مسلط کیوں نہ ہوں۔ لیکن مراد ساحر کو سچ کہنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ انہیں ہر حال میں ہر صورت میں ظلم وزیادتی کے خلاف حق کی بات کرنی ہے۔ تاریکیوں کے خلاف روشنیوں کی بات کرنی ہے۔ انہیں بہر صورت عوام سے دوستی کا حق نبھانا ہے۔ ان کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرنا ہے۔

مجھے ویران زندگی کی بات کرنی ہے

سخت جانی و جانثاری کی بات کرنی ہے

ہر طرف گرد و غبار ہے اب تک

مجھے ظلم و زیادتی کی بات کرنی ہے

فضائے دہر پہ تاریکیاں مسلط ہیں

مجھے رنگ و روشنی کی بات کرنی ہے

یہاں ہر روز مغرور گردنوں کی فصل کٹتی ہے

مجھے لہو کی ارزانی کی بات کرنی ہے

جسم جیسے جلتا دوزخ ہے

مجھے غم کی کہانی کی بات کرنی ہے

مجھے ہر عہد جبر میں ساحر

دوست سے دوستی کی بات کرنی ہے۔ (۸۵)

جانتا ہوں کہ کون تاریک شبوں کو کھینچ لایا ہے

مگر میں شب کے سینے سے اک نئی صبح تراشوں گا

اک اک بکھرے ستاروں کو جمع کر کے

میں روشنی کا اک کہکشاں بنالوں گا۔ (۸۶)

☆

میں موت کا جام پی لوں گا

تا کہ زندوں میں شمار ہو جاؤں

میں سہہ رہا ہوں رنج والم

(تا کہ) تیرے درد کا غم خوار ہو جاؤں۔ (۸۷)

پچھلے کئی سالوں سے بلوچستان دوہری جبریت کا شکار رہا ہے۔ جہاں ایک طرف خارجی اور سیاسی دباؤ، عدم تحفظ، معاشی و معاشرتی سطح پر ناانصافی اور خوشحالی و ترقی کے سفر میں عدم برابری اور محرومی جیسے مسائل نے عوام کو پریشان کیئے رکھا۔ تو دوسری طرف وہیں پہ ان کے اپنے سیاسی اور قومی رہنماؤں کی نااہلی، منافقت، جھوٹ اور فریب نے انہیں ایک نئے بحران سے دوچار کیا۔ اس لئے ہر ادسا حر سیاسی اور قومی رہنماؤں کو مسائل و مشکلات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے مختلف علامتوں اور استعاروں کے ذریعے ان کی مذمت کرتے ہیں۔

ساحر کیسے یقین آ تا لوگوں کو

یہ وعدہ تم نے کئی بار کیا۔ (۸۸)

☆

رہنے دیجیے وعدۂ فردا کے سبز باغ

کہ بھوک سے مر گیا ہوں میں

یہاں کسی عہد میں خوشیوں کی برکھا برستی تھی

اب کہ ہر طرف رنج والم میں گھر گیا ہوں میں۔ (۸۹)

☆

اے خوش لباس و خوش خوراک
خاک نشینوں سے خوشحالی کی بات نہ کر
ہم برہنہ اور خستہ تنوں سے
مال و متاع کی بات نہ کر
تم کہ ناجائز کمائی پر پلے ہو
مجھ سے حق و انصاف کی بات نہ کر
آج تیرا کیا کردار ہے تم ہی کہو
ہمیشہ کل یزداں کی بات نہ کر۔ (۹۰)

☆

کیسے ڈھانپ لوں تیرے عیبوں کو
میرے پاس کوئی ایسا لباس نہیں۔ (۹۱)

☆

یہ میٹھی باتیں اور خوشحالی کے اعلانات
ان سے پیٹ بھرتا نہیں بھوکوں کا۔ (۹۲)

نیب حکومت کے خاتمہ کے بعد سیاسی رہنماؤں کی شخصیتی اور فکری تضاد، نااتفاقی، سیاسی تحریک کی ناکامی، انتشار و خلفشار اور تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں نہ صرف بلوچ معاشرت زندگی کی اجتماعی سطح پر ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہوئی۔ بلکہ داخلی و داخلی سطح پر بھی ہر فرد اندر سے ٹوٹ گیا۔ اس زوال کی کیفیت کے نتیجے میں بیگانگی،

مغائرت، زندگی سے فرار اور گریز، بے حسی، بے کلی اور بے یقینی کا ایک ایسا فضا قائم ہوا کہ یہاں ہر فرد دوسرے فرد سے بیزار نظر آتا ہے۔ کیونکہ بلوچ عوام نے سیاسی تحریک سے جو امیدیں اور توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ جب وہ پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو لوگ اجتماعیت کے دھارے سے کٹ کر اپنی ذات میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مراد ساحر نے اس صورتحال کو جا بجا اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

حوشی کا احساس ہے نہ غم کی کسک ہے کہیں
سلسلہ روز و شب کا یہ کیا عذاب آ گیا ہے دوستو
درد و غم کے بادل چھا گئے ہیں ہر طرف
غم دوراں کا یہ کیا عذاب آ گیا ہے دوستو۔ (۹۳)

☆

آرزوؤں کا نتیجہ کیوں ہے بربادی
میں ہر وقت محو خیال رہتا ہوں
جواب ان کے دل سے کیا ملے ساحر
میں خود سے یہ سوال کرتا ہوں۔ (۹۴)

☆

یہ کیسی بے زباں سرزمیں ہے
کہیں سے کوئی صدا نہیں آتی
یہ کیسی تاریک شب نے گھیرا ہے

کہ اپنی ذات بھی نظر نہیں آتی۔ (۹۵)

☆

ہر سو بے بسی کی پرچھائیاں مسلط ہیں
ہر طرف شور برپا ہے نا اُمیدی کی
اپنی ذات سے بھی اٹھ گیا یقین
پھر ادراک کیسے ہو بے یقینی کی۔ (۹۶)

ایک سچے قلم کار اور ادیب کا فرض ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی مثبت معیار و اقدار کو تقویت پہنچائے اور سماج کی برائیوں، بدصورتی اور ظلم و جبر کے خلاف اپنے عوام کا ساتھ دے۔ مراد ساحر بھی اپنے فکر و فن کے حوالے سے ایسے ہی سچے فن کاروں کی صف میں شامل ہے۔ جو ظلم و جبر کی قوتوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ظلم کو ظلم اور رات کو رات ہی کہتے ہیں۔

مراد ساحر بلوچستان کے مزدوروں، محنت کشوں، چرواہوں، ماہی گیروں، کسانوں، پس ماندہ اور مفلوک الحال لوگوں کا شاعر ہے۔ وہ انتہائی سادہ، آسان اور سہل انداز میں ان سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ان کے مسائل و مشکلات کی بات کرتے ہیں۔

تیشہ، کدال اور درانتی پرولتاری قوت و طاقت کی علامت ہیں۔ محنت اور جدو جہد کا استعارہ ہیں۔ محنت کش اور نچلے طبقے کے اتحاد و اتفاق کا حوالہ ہیں۔ مراد ساحر اس عوامی طاقت و قوت پر یقین رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ تیرے ہاتھوں میں بڑی طاقت ہے
میرے مقدر پہ تو اپنے ہاتھ کا سایہ کردے۔(۹۷)

☆

قوم کے کوہ قلعوں کی بنیادیں ہیں
برہنہ پا اور برہنہ تن ہیں جو لوگ۔ (۹۸)

☆

یہ اپنی سرزمین غریبوں کی
ناتوانوں کو طاقت ور بنادے گا۔ (۹۹)

مراد ساحر کی شاعری میں جدوجہد، اتحاد و اتفاق اور آزادی و انقلاب کی خواہش سے لے کر زندگی کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کے بارے میں جانکاری ملتی ہے۔ مگر ان کی شاعری کا بنیادی اور مرکزی موضوع پچھلے پچاس برسوں کی سیاسی انحطاط و انتشار ہے جہاں ان کے نزدیک بلوچ عوام کی جدوجہد اور قربانیوں کے بے ثمر ہونے کا بنیادی سبب بلوچ سیاستکاروں کی نااہلی، بے عملی اور بے علمی ہے کہ انہوں نے جمہور کی جدوجہد اور قربانیوں کو اپنی مفادات کا بھینٹ چڑھالیا۔

☆

ساحر بدکردار اور جاہل رہبروں نے
ہم پہ خوشحالی کا دروازہ بند کیا۔ (۱۰۰)

☆

نااہل اور بے سمجھ رہبر ہمیں
زندگی کی جنگ میں بنا اسلحہ لے کر گئے۔(۱۰۱)

☆

ساحران رہبروں کو غور سے دیکھو اگر
ایک سے ایک بڑھ کر تجھے احمق ملے گا۔ (۱۰۲)

عطا شاد

عطا شاد جدید نظم کا اہم ترین شاعر ہے۔ جس نے نئی نظم کی فکری اور فنی نہت میں اہم کردار ادا کیا۔ اور اسے نئی فکری اور فنی کروٹوں سے آشنا کیا۔ عطا شاد سے پہلے بلوچی نظم فنی طور پر اتنی بلند نہ تھی یہ عطا شاد ہی تھے جنہوں نے بلوچی نظم کو فنی رفعت عطا کی۔

عطا شاد نے بلوچی نظم میں سب سے زیادہ فارم کے تجربے کیئے اور اسے طرز احساس سے لے کر طرز اظہار تک انقلابی تبدیلیوں اور رویوں سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے علامتیت Symbolism، تصویریت Imageism اور ڈرامائیت کے نئے چراغ روشن کر کے بلوچی شاعری میں ایک نئے تجرباتی دور کا آغاز کیا۔

ان کی شاعری محض لسانی تجربہ ہی نہیں بلکہ زبان کی نئی تشکیل اور نئے علامات واستعارات کے دریافت کرنے کا ایک تخلیقی عمل ہے۔ جو نئی نظم کو ایک نئی

زندگی اور نئی توانائی فراہم کرنے کا سبب بنی ہے۔

عطا شاد رجحان ساز (Trend maker) تخلیقی شخصیت کے مالک تھے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ بلوچی نظم میں آزاد نظم کا فروغ ہے۔ گو کہ سب سے پہلے آزات جمالدینی ہی نے بلوچی شاعری میں آزاد نظم کا تجربہ کیا تھا اور اسے بنیاد فراہم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ لیکن عطا شاد تک آتے آتے نظم نے جہاں نئے رویوں اور رجحانات کو اپنے اندر سمولیا۔ وہیں عطا شاد کے وسیلے سے نئی لفظیات و تجربات نے نظم کے کینوس میں بڑی کشادگی اور وسعت پیدا ہوئی۔

عطا شاد نے اپنے تجربات کے اظہار کے لئے نئے سانچے تلاش کیئے جو محض نئے الفاظ کی تلاش ہی نہ تھی بلکہ اظہار کی نئی صورتوں کی تلاش ان کے پیش نظر رہی۔ ان کے یہاں اظہار کی نئی صورتوں کی تلاش کا رویہ اور ان کا طرز اظہار اپنے دور میں غیر روایتی ہونے کے سبب مشکل اور عام قاری کے لئے تفہیم کا مسئلہ بھی بنا رہا۔ اور لوگوں نے اس جدت کو بدعت سمجھ کر اس کی مخالفت کی۔ لیکن عطا شاد نے جلد ہی جدیدیت کے علم بردار کے طور پر خود کو منوالیا۔

عطا شاد نے ہی سب سے پہلے الفاظ و تراکیب کو مروجہ زبان و بیان کے سانچوں سے نکال کر پراسرار رومانی تلازمات کا ایک نیا نظام وضع کیا۔ اور یہ رومانی تلازمات اپنے اندر کئی جہتیں اور پرتیں لیئے ہوئے نظر آتی ہیں۔ ان جہتوں، پرتوں اور تہہ در تہہ ذاتی اور شخصی علامتوں کے پس منظر ہی میں ان کے فکری رجحانات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اور ان کی ذات کے بعض پہلوؤں اور گوشوں تک رسائی حاصل کیا جا سکتا

ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عطا شاد کے ساتھ ایک ذہنی رشتہ قائم کر کے ہی ان کے باطن میں جھانکا جا سکتا ہے۔ کیونکہ عطا شاد کی تمثیلی زبان کو لفظی اور ظاہری سطح پر دیکھنا ممکن نہیں۔

''عطا شاد کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس کی زبان کو سمجھنا ہوگا۔ اس کی زبان ہزاروں برس پرانی اشکالی زبان (Hieroglaphic) کی طرح پراسرار ہے۔ اس کے الفاظ کی اپنی معنویت ہے۔ ہر علامیہ (Symbol) اس کا اپنا وضع کردہ علامیہ ہے۔ اس کے لئے سنجیدہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔ جس میں تین عناصر ضروری ہیں۔ عطا کی حالات زندگی، بلوچستان کی تاریخ، سماجی، معاشی دباؤ اور انتظامی کاروائیاں۔

عطا کا صرف ایک ہی شعر

کوہساروں کی عطا رسم نہیں خاموشی

رات سو جائے تو بہتا ہوا چشمہ بولے۔

کی روشنی میں دیکھا جائے تو مفہوم کھلتے رہیں گے۔ اور معلوم ہوگا کہ عطا تو طلسمی ٹوپی پہنے گرفت سے بچا رہا۔ وہ میکدے کی چھاؤں سے شارٹ کٹ کے ذریعے نہیں گذرا۔ اس نے ایک اذیت ناک صورتحال پر احتجاج کیا ہے۔ نظام پر ضرب لگانے کی کوششیں کی ہیں۔ وہ نظریاتی انسان تھا۔ کومٹ منٹ (Commitment) کا انسان تھا۔'' (۱۰۳)

واضح سیاسی ملک اور معاشرتی کومٹ منٹ رکھنے کے باوجود عطا شاد نے ترقی پسند اسلوب سے شعوری طور پر گریز کیا۔ اور کہیں بھی تبلیغ کے انداز اور نعرے

بازی کو اپنے فن پر حاوی ہونے نہ دیا۔ اور جہاں کہیں انہوں نے احتجاجی رویہ اختیار بھی کیا۔ وہاں بھی کسی مسلکی غلبہ واثر کے برعکس عصری صورتحال کو فنی پیرائے میں بیان کیا۔ اور فن کو نظریہ کی سیڑھی بننے نہ دیا۔ حالانکہ وہ ایک کمٹڈ ترقی پسند تھے۔

عطا شاد کی شعری دنیا ایک پراسرار رومانی اور ایک مخصوص دیو مالائی احساساتی فضا کا حامل ہے جہاں ان کے خواب، خواہشیں اور آرزوئیں نمایاں ہیں۔ ان خوابوں اور خواہشوں کی بنت اس قدر ذاتی اور شخصی ہے جہاں معاشرے کا دکھ بھی عشق ومحبت کا شخصی اظہار بن کر سامنے آتا ہے۔

عطا شاد کی ذات کا یہ شخصی اور ذاتی پہلو ان کی ذاتی اور نفسیاتی زندگی میں پیوست ہے۔ جہاں وہ خارجی مسائل کو اپنی داخلی زندگی سے ہم آہنگ کر کے ایک نئی صورتحال کی تخلیق میں منہمک نظر آتے ہیں۔

آغا گل نے عطا شاد کے اس رویے کو قدیم یونانی فلسفی دیوجانس کلبی کے رویہ سے مماثل قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''دیوجانس کلبی جس کا کہنا تھا کہ لوگ عقل و حکمت کی باتیں نہیں سمجھتے۔ انہیں کھیل تماشا دکھا کر ہی سمجھایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا کہنا تھا کہ عقل مندوں کو احمقوں کی طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ کیونکہ انسانی معاشرہ عقل مندوں کو قبول نہیں کرتا۔ عقل مندوں کے سر پھرے، ویران جزیروں میں برس ہا برس قید تنہائی کا شکار رہے۔ مگر پھر بھی کسی دیوانے کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ مسیحی چرچ قرون وسطیٰ میں ڈرامے دکھا دکھا کر انسانوں کو مسیحی چرچ اور اس کے عقائد کی جانب راغب کیا کرتے تھے۔

عطا شاد نے وہی دیو جانس کلبی کا انداز اختیار کیا۔ بیوروکریٹ بھی رہا، سرکار دربار میں عزت پائی۔ مگر جو چاہتا تھا۔ وہی کہا۔ جو پیغام دینا چاہتا تھا۔ وہی پیغام دیا۔ اور اس کا کمال یہ ہے کہ انقلابی شاعر کی بجائے وہ ایک رومانی شاعر مشہور ہوا۔ حالانکہ وہ اپنے عہد کی سیاسی وسماجی تہذیب کا مظہر ہے۔'' (۱۰۴)

شاید یہ بات کسی حد تک درست بھی ہو مگر میرے خیال میں عطا شاد نے اپنے آپ کو کیموفلاج کرنے کی بجائے اپنے عہد کے کرب کو اپنی داخلی وجود میں ڈھال کر فن کی معنویت کو ایک نیا زاویہ عطا کیا۔

عطا شاد بنیادی طور پر بڑی پیچیدہ اور مضطرب نفسیات کے مالک تھے۔ یہی مضطرب نفسیات اور ان کی اندرونی اضطراب کا بہاؤ ان کی شاعری میں در آئی ہے۔ جہاں ان کے ہاں احساس وجذبات میں ہر لمحہ شکست وریخت کا عمل دکھائی دیتی ہے۔ عطا شاد کی تخلیقی عمل کی پیچیدگی میں بیک وقت دیومالائی اسرار، فلسفیانہ دبازت اور انسانی شعور کے سفر کا ایک پر پیچ سلسلہ نمایاں ہے۔ جسے صرف ان کے ساتھ ایک ذہنی رشتہ استوار کر کے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

عطا شاد کی شاعری کا بنیادی المیہ ان کی ذات اور ان کے عہد کے بے سروسامانی کا المیہ ہے۔ یہ المیہ ایک ایسے عہد اور معاشرے کی کہانی ہے۔ جس میں ایک طرف کوئی ارتقائی عمل، کوئی تغیر، کوئی پیش رفت (Progression) یا انقلابی تبدیلی ممکن نظر نہیں آتی۔ دوسری طرف معاشرے کا ہر فرد ایک (Living dead man) کی تصویر بنا نظر آتا ہے۔ جہاں کوئی آواز اپنی نہیں ہے اور کوئی وجود اپنا نہیں

ہے۔معاشرے کا جمود اس کی فرسودگی اور کہنگی انحطاط وزوال کی آخری حدوں تک چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔

نئی زندگی ،تمدنی تبدیلی اور ایک روشن مستقبل کا تصور عطا شاد کا وہ خواب ہے۔جس کی تعبیر کے وہ آرزومند رہے ہیں۔یہی خواہش اور آرزو نہ صرف انکی بیشتر نظموں میں نمایاں ہے بلکہ دوسری طرف یہی خواہش اور آرزو ان کو مایوس ہونے کے برعکس حیات پسندی کے تصور کی جانب کھینچ لاتا ہے۔ان کی نظمیں بالخصوص ''وس ءِ بے وسی'' (بس کی بے بسی) راہ گوز (رہرو) چیر (گردش) زہیرانی زارہ (نوحہ فراق) اُمیت ءِ سودگراں پہ موتکے (اُمید کے سوداگروں کے لیے ایک مرثیہ) کج انت زمین کج انت آسماں (کہاں زمین کہاں آسمان) اور بالعموم پلانی ھشکیں پن (پھولوں کی خشک پتیاں) روچ کجا در پشگا انت (سورج کہاں جلوہ گر ہے) کجا ماہکان (کہاں چاندنی)،منا چہ بے وسیں دل (دل مجھ سے نالاں ہے)،دل ءَ نہ من ات (دل نہ مانے) جیسی نظمیں اور غزلیں ایک نئی زندگی کے ظہور (Emergence) کا تقاضہ کرتی ہیں۔مگر نئی زندگی ،تبدیلی عطا شاد کے عہد کا تاریخی المیہ ہے جو وقوع پذیر نہیں ہو رہی ہے۔

ہم کہ منتظر سحر ہیں
مگر سحر کہاں ہے؟
ہر سمت برس رہی ہے
تیری یادوں کی برکھا

خاک منزل کی سوغات حد نگاہ سے پرے ہے۔

ہم اپنے خارِ مغیلاں کے جلتے انگارے

اجنبی وطن نا آشنا کہاں ہے۔

فراق کا درد ہو تم

میں دل کا خلش ہوں۔

آ کہ موجہِ خیال کی لاش کو

ناتواں کندھوں پہ اُٹھالیں

صدیوں کی اُمیدِ موہوم کے بوجھ کو

کمزور بازوؤں میں سمیٹیں

انتظار کے بارگراں کو سر پہ اُٹھالیں۔

(راہ گوز)(۱۰۵)

☆

خُدا!

اے خدا!

کہاں ہے وہ جہاں

وہ آسمان وزمین

کہاں ہے وہ شب سحر کی نمود

وہ ستارہ لالہ نما

وہ ماہ نور فلک۔۔۔۔

کہاں ہے۔۔۔۔؟

کہاں ہے وہ جہاں؟

خدا، اے خدا (وس ءِ بے وسی) (۱۰۴)

میں کہ یہاں

شکستہ یادگاروں کی مانند جلی لاش ہوں۔

میں اپنے سہانے مستقبل کے خوابوں کے گہرے سمندر میں

یادوں کے خونچکاں پانیوں سے

ونت کے بے رحم موجوں کی دیواروں سے

کہاں تک لڑتا رہوں گا

آخر ڈوب ہی جاؤں گا۔

کہاں ہے جہاں؟

وہ جہاں!

اے میرے خدا!

☆

یہ ڈھلتی شام کے سرسراتے سائے

میں نہ جانوں

کس ویراں شب کو جلا کر

لاکھ کے ڈھیر میں بدل دیں

دل کو آگ لگا دیں

ہزار رنج ہیں، ہزار زخم ہیں، ہزار غم ہیں

ہزار لمحاتی دائرے ہیں۔ (چہر)(۱۰۷)

☆

سورج کہاں جلوہ گر ہے؟

اس تیرہ نگاہی کا انجام کون دیکھے

کہ آرزوؤں کی رات بے کنار ہو تاریک تر ہے

وائے ہماری متاعِ آگہی کی شرر کی رسائی

کہ زندگی جانکسل سلاخوں کے پیچھے بے بس و بے اماں ہے۔

یہ شرر کہ روشنی کا مبتدا ہے

زندگی کا ارتقا ہے۔

یہی شرر جو آتش پذیر

ماہ و انجم کی دہلیز کو چھو گیا۔

مگر ہمارے دل کی ویرانیوں کو کچھ نہ دے سکا۔

(روچ کجا)(۱۰۸)

☆

شام ہو یا کہ صبح

رنگ شفق کی بات ہو یا ذکر ہو ڈھلتی شام کا
کیا دھنک، کیا رقصِ گھٹا، کیا بادِ سمیں، کیا سرزمین
اب سب پہ اُٹھ گیا اپنا یقین
دل نامراد اب تو گداگر کی طرح
سب بن کر اور سمجھ کر بھی خاموش رہتا ہے۔
خواہش کسی بے منزل مسافر کی طرح
یونہی راہوں میں بھٹکتا ہے۔
کہاں زمیں، کہاں آسماں سراغ شب نہ دن کا نشاں
چاند نہ چاندنی، نہ کوئی کہکشاں سراغ شب نہ دن کا نشاں۔
(کج انت زمین)(۱۰۹)

☆

رات ہوتی ہے (سنا ہم نے بھی ہے)
دن چمکتا ہے (لوگ کہتے ہیں)
مگر کون جانے تمیز روز و شب
اب تو لگتا ہے دونوں مرحوم ہو گئے ہیں
(اُمیت ءِ سودگراں)(۱۱۰)

☆

ان نظموں میں عطا شاد جہاں ایک طرف بلوچ معاشرہ کی اجتماعی بے حسی کی

وکالی کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف یقینی ردعمل سے محروم بلوچ عوام کی بے بسی اور بے نامیت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ان نظموں میں موضوعات جذبات سے بلند ہوکر ایک گہری فکر و ادراک لیے نظر آتے ہیں۔ جہاں بلوچ معاشرہ ایک بے چہرہ معاشرہ ہے۔ جس نے اپنی شناخت، پہچان اور تشخص کھودی ہے۔ اور اس بے چہرہ معاشرہ میں ہر چہرہ خود غرضی، بے حسی، لاتعلقی اور بیگانگی کا چہرہ لیے نظر آتا ہے۔ اس تمام تر صورتحال کا ذمہ دار گذشتہ چند برسوں کا وہ سیاسی اور اخلاقی انحطاط ہے۔ جس نے معاشرے سے اس کا یقین اور اعتماد چھین لیا۔ ان کی امیدوں، امنگوں اور آرزؤں کا وہ خواب چھین لیا جو ان کے زندہ رہنے کا باعث بنا رہا۔ اس زوال پذیر صورتحال نے بلوچ معاشرہ کے نظام فکر و خیال، اچھائی اور برائی کے معیار و اقدار، انسانی رشتہ و تعلقات کے تمام تر معانی و مفاہیم کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔ عطا شاد نے ایک حساس فنکار کی حیثیت سے اس صورتحال کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

انگریزی کے مشہور نقاد میتھیو آرنلڈ نے انیسویں صدی کے وسط میں اپنے عہد کے انتشار اور زوال کو انتہائی کرب کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم لوگ اس وقت دو دنیاؤں کے درمیان سانس لے رہے ہیں۔ ایک تو مر چکی ہے۔ اور دوسری اس قدر بے سکت ہے کہ کسی طرح پیدا نہیں ہو پاتی" عطا شاد کا کرب اور دکھ بھی یہی ہے کہ وہ بیسویں صدی کے اختتام پر جس سحر اور جس جہاں کی آرزومند رہے ہیں۔ وہ جنم نہیں لے رہی ہے۔ کیونکہ تمدن اور تہذیبی انتشار کے باعث بلوچستان میں ایک بہتر اور متوازن معاشرہ کا خواب ادھورا نظر آتا ہے۔ بلوچستان کے عوام

معاشرتی ،تہذیبی ،سیاسی ،ذہنی اور نفسیاتی سطح پر تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہیں ۔عطا شاد کی نظم ''امیت ءِ سودگراں پہ موتکئے'' الماس ،سنگ جاہ (سنگ گاہ)، کج انت زمین (کہاں ہے زمین)،شب کہ بام مہ ساریت (وہ شب کہ جس کا سحر نہ ہو) بلوچستان کے عوام کی اجتماعی فکر وشعور کے زوال کا نوحہ بھی ہے۔اور نئی زندگی اور نئی اجتماعیت کی آرزو بھی۔

شوق بوس و کنار کے
ہزار نخل مرجھا گئے
سنگ گاہ میں تجھے تلاش کس گہر کی ہے
تحریر سجدگان، محروم ساعتوں کے دل کے ویران مزار کے

شکستہ پتھروں سے الجھ گئے ہیں
کن شکستہ بتوں سے زیست کا مدعا طلب کر رہے ہو۔
(سنگ جاہ)(۱۱۱)

☆

کہاں زمین، کہاں آسمان، سراغ شب نہ دن کا نشان
چاند نہ چاندی نہ کوئی کہکشاں، سراغ شب نہ دن کا نشاں
نہ کوئی نقش پا، سراغ راہ۔ نہ کوئی منزل مراد
جائے تو جائے کہاں دل کا کارواں سراغ شب نہ دن کا نشاں

کس نوید صبح کی خاطر کہاں چلے، کدھر چلے کہاں ہے منزلِ مراد

اے راہروانِ مرادکارواں، سراغ شب نہ دن کا نشاں

جاگتا رہتا ہے دل اپنا، مگر صبح مراد سو گیا ہے کہیں

کہاں لے کے پھروں دلِ شہر فناں سراغ شب نہ دن کا نشاں۔

(کج انت)(۱۱۲)

☆

زندوں کے لیے یہ جہاں رنگ و روشنی کا آئینہ ہے

مردوں کے لیے شب و روز دونوں ایک جیسے ہیں۔

ظلمت پرستوں کے لیے دن ہے بے معنی شب ہے بے مقصد

روشنی کے پیداوروں کے لیے شب و روز ایک جیسے ہیں

عطا ہمارے ہاں بہرے اور کور چشموں کی فرمانروائی ہے۔

کسی کو کہوں، کس کا نام لوں، شب و روز دونوں ایک جیسے ہیں۔

(کج انت زمین)(۱۱۳)

☆

وائے دل کی سرزمین
بہت دور ہے اس تونگر جہاں سے
خیال کی وسعتوں کا نیلگوں آسماں
اس ویراں بیاباں جنگل میں
مدتوں اور صدیوں کی متاع
اگر کچھ ہے تو فقط
خواہش کا تن برہنہ فقیر
امید کا کچکول لیے
الماس کی ایک کرن مانگنے
سربگر یباں پھر رہا ہے۔(الماس) (۱۱۴)

☆

عطا شاد کی یہ نظمیں سیاسی وفکری سطح پر زوال پذیر بلوچ معاشرت کی نمائندگی کرتی ہیں کہ جہاں بلوچ قوم کا مستقبل بے سمتی جیسے خدشات سے گھرا نظر آتا ہے۔اس لیے ان نظموں میں سہب (صبح) بام (شفق) سمین (صبا) استین (بادل) روچ (سورج) مہر (محبت) ھتم (بہار) واہگ) (خواہش) جیسی علامتیں نہ صرف منفی انداز میں استعمال ہوئی ہیں۔ بلکہ ان نظموں کی اندرونی آہنگ اور فکری دائرہ میں بھی مسلسل ایک توڑ پھوڑ کا عمل نمایاں ہے۔ بظاہر یہ علامتیں بے بسی

،نا امیدی، مایوسی جیسے رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔ لیکن صورتحال کا اگر درست تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ گذشتہ کئی سالوں سے بلوچستان کا معاشرہ شکست وریخت، فرار و گریز اور بے مقصدیت و لامرکزیت کا شکار نظر آتا ہے۔ اس لیے ہر چیز بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

عطاشاد کی بیشتر نظمیں رومانی تلازمات کے پردوں میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جہاں وہ اپنی وضع کردہ شخصی تراکیب۔ علامتوں اور تمثیلوں کے ذریعے اپنی ذاتی احساسات کو بیرونی سطح پر متشخص کرتے ہیں۔ اور انہی کے حوالے سے اپنی ایک علیحدہ دنیا بسائے رکھتے ہیں۔ انکی شخصی اور ذاتی علامتیں بیک وقت معنویت کے کئی پہلو لیئے ہوتے ہیں۔ اور ان کے رومانی تلازمات کا رشتہ ایک سے زیادہ سمتوں اور جہتوں میں قائم ہے۔ جس سے ان کی بہت سی نظمیں مکمل طور پر بے نقاب ہو نہیں پاتیں۔

عطا کی نظموں میں قومی اور بین الاقوامی سیاسی اشارات بھی نمایاں ہیں۔ لیکن ان کے یہاں سیاسی اور سماجی مسائل کا اظہار بھی واقعہ نگاری کی بجائے تخلیقی اور فنی مراحل سے گذر کر نظم کے قالب میں ڈھلتا ہے۔ اپنی مشہور نظم سہکندن (نزع) کی سیدھا سادا طرز تخاطب اور ٹھوس حقیقت نگاری اختیار کرنے کے باوجود بھی وہ اس کی نعرے بازی کا شکار ہوتے نظر نہیں آتے۔ بلکہ اس میں جذبات واحساسات کی ایک شائستگی وارفتگی نمایاں ہے۔ عطاشاد کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے مسائل کو مختلف علامتوں اور استعاروں کے ذریعے ترتیب دیتے ہیں۔ اس لیے ان کا طرز اسلوب اپنے عہد کے روایاتی اسلوب سے یکسر مختلف نظر آتا ہے، یہاں انکی مشہور نظم "ساہ کندن" کے چند

اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔ سروں کے ڈھیر لگانے سے سوچ مر نہیں سکتی

گل کے مسلنے سے خوشبو سمٹ نہیں سکتی

مجھے قتل کرنا ہے تو میری روح کو تہہ تیغ کرو

مجھ کو مٹانا ہے

تو محبتوں کو مقتل کی چوکھٹ پہ قربان کرو

مجھے مارنا ہے تو

میری شعور کو تہہ تیغ کرو

میری سوچ کو نیست و نابود کرو

مگر میرا مرنا ممکن نہیں ہے۔

میں تو محبت ہوں

ابد تک امر ہوں

میرے نقش قائم ابد تک رہیں گے

جب تک زندگی ہے میرے لہو کا ہر اک قطرہ

روشنی بن کر جگمگاتا رہے گا۔

گر میں مر گیا، تو تم بھی مرو گے

تم زندہ ہو جب تک

میں بھی زندہ رہوں گا۔ (سہکندن) (۱۱۵)

''نزع'' موت اور زندگی کی کشمکش کے تناظر میں مزاحمت کی ایک ایسی

تاریخ رقم کرتی ہے جہاں زندگی موت کی سولی پر لٹک کر بھی انسان کے لیے تاریخی طور پر زندہ اور امر رہنے کے امکانات مہیا کرتی ہے۔

عطا شاد سمجھتے ہیں کہ جبر کا ہاتھ ایک فرد کی زندگی کا چراغ تو گل کر سکتا ہے لیکن سوچ کو نہ تو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی شعور کو تہہ تیغ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سروں کے ڈھیروں لگانے سے فکر مر نہیں سکتا۔ اور گل کے مسلنے سے خوشبو سمٹ نہیں سکتی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر مجھے مارنا ہے تو میرے شعور کو تہہ تیغ کرو، میری روح کو مصلوب کرو۔ میرے یقین کو گولی کا نشانہ بناؤ۔ مگر یقین کو گولی سے کہاں اڑایا جا سکتا ہے؟ روح کو کیسے مصلوب کیا جا سکتا ہے؟

بلغاریائی شاعر نکولا واپستاروف نے کہا تھا "کل یہ زندگی سیانی ہوگی۔ یہ یقین میرے سینے میں قائم ہے۔ اور وہ گولی کہیں نہیں، جو اس یقین کو لگ سکے۔" (۱۱۶)

عطا شاد کے ہاں بھی زندگی کے امر ہونے کا احساس نمایاں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ انسان مرتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی، زمین اور تہذیب ہمیشہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ جوہر میر نے ایک جگہ کہا تھا۔

؎ اک ہم ہی نہیں، اہل قلم اور بھی ہوں گے
لکھیں گے جو روداد ستم اور بھی ہوں گے
اے نوحہ گرو صف ماتم نہ بچھاؤ
زندہ ہیں ابھی ہم اور غم اور بھی ہوں گے

عطا شاد نے ایک جگہ کہا تھا کہ ''مرک بازانت اگاں زندمانی بہ بیت''یعنی اگر زندگی رہی تو موت بھی فراواں رہے گی''(۱۱۷)

عطا شاد ایک باشعور تخلیق کار کی حیثیت سے زندگی کو ایک عہد ،ایک رخ ،ایک نسل ،ایک تاریخ کے حوالے سے دیکھنے کی بجائے اس کی کلیت اور ابدیت پر یقین رکھتے ہیں۔وہ اپنی نظم ساعت نمیران انت (وقت امر ہے)

میں زندگی کی ابدیت کے تناظر میں تابناک انسانی مستقبل کے آرزومند نظر آتے ہیں

وقت امر ہے
انسان مرتے ہیں
میں ایک نئی اعلیٰ وارفع
زندگی کا منتظر ہوں(۱۱۸)

اکبر بارکزئی

دنیا بھر کی تخلیق کی جانے والی ہم عصر شاعری اور عالمی ادبی رجحان ومیلانات سے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ اکبر بارکزئی ایک گہری بصیرت اور تخلیقی ادارک رکھنے والے شاعر ہیں۔ان کی شاعری کی مختلف سطحیں اور پرتیں ہیں۔ باریک بینی سے اگر ان پرتوں اور سطحوں کو دیکھا اور کھنگالا جائے تو تخلیقی طور پر الگ تھلگ اور جدا ہونے کے باوجود فکری اعتبار سے ہر سطح دوسری سطح سے مربوط اور جڑا نظر آتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری کے یہ مختلف سطحیں ان کے فکری ارتقاء کی دو منزلیں ہیں جہاں وہ ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف گامزن نظر آتے ہیں۔

ن۔م۔ دانش نے یوری یورسیف کے حوالے سے فن کی چار صورتوں I & I, I & You, I & We, I & Every body کو سامنے رکھتے ہوئے اکبر بارکزئی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''I & I کا سطح اکبر بارکزی کی ابتدائی شاعری میں نمایاں تو ہے۔لیکن اس سطح پر بھی ان کی لاشعوری کیفیت اور نفسیاتی پیچیدگیاں ان کی ذات سے بہت ہی کم متصادم نظر آتی ہیں۔جبکہ ان کی شاعری کی دوسری سطح I & You دو فرد کے مابین رشتہ اور تعلق کے حوالے سے نہ ہونے کے برابر ہے۔اگر کہیں ہے بھی تو وہ چند غزلوں میں نمایاں ہے۔اکبر بارکزئی نے اس ''تو'' کی سطح کو ''ہم'' میں بدل دیا ہے۔ان کی شاعری میں ''تو'' ایک فرد نہیں بلکہ یہ ''تو''

بلوچی عوام ہے۔ جو ''ہم'' میں بدل کر اجتماعی کیفیت کا حامل بن گیا ہے۔

اکبر بارکزئی کی شاعری کی تیسری سطح جس کا تعلق ''ہم'' سے ہے۔ نہایت ہی توانا اور جاندار ہے۔ کیونکہ بلوچی شاعری کا بنیادی موضوع بلوچ عوام، بلوچ عوام کی بدحالی، پس ماندگی، جبر وستم، خوداختیاری جیسے مسائل کے گرد گھومتا ہے۔

بلوچی شاعری کا اصل جوہر اجتماع ہے۔ اس کی وجہ بلوچ قوم کی اجتماعی قبائلی نظام اور اجتماعی مزاج بھی ہوسکتا ہے۔ اور بلوچستان کی سیاسی صورتحال اور تاریخ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچ قوم دوستی کا تصور نہ صرف بلوچ سیاست میں نمایاں رہا ہے بلکہ بلوچی ادب بالخصوص بلوچی شاعری میں اس کی اثرات کو بخوبی طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے اکبر کے یہاں شاعری کی دوسری سطح ''تو'' ایک فرد کے حوالے سے کبھی محبوب کی شکل میں رسماً اور تکلفاً آتا ہے۔ وگرنہ اس کا محبوب اجتماعی طور پر اس کی سرزمین، اس کی قوم اور سرداروں اور ظالموں کے ظلم وستم کے خلاف اس کی نفرت کا ردعمل ہے۔'' (۱۱۹)

"I & Everybody" اکبر بارکزئی کی شاعری کا سب سے اعلیٰ وارفع اور محکم ترین سطح ہے۔ کہ جس میں پورے بنی نوع انسان کو صرف اور صرف انسان کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ اسی لئے وہ دنیا کی ہر انقلابی تحریک اور انقلاب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اور ان کی خوداختیاری کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اکبر بارکزئی کی ''ویٹ کانگ'' اور ''ثور انقلاب'' جیسی نظمیں سیاسی اور بین الاقوامی۔ یا ایک انقلاب دوست ذہن کے حوالے سے انقلابی رجائیت کا مظہر ہی نہیں بلکہ ان کے خمیر میں

انسان دوستی کا جذبہ شامل ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کا کینوس نہایت ہی وسیع حیثیت کا حامل ہے۔ (۱۲۰)

اکبر بارکزئی کے ہاں زندگی محدود اور مختصر خیالات واحساسات کا نام نہیں۔ بلکہ وہ پتھر، ہوا، بادل، سورج، چاند، آگ، کہکشاں سے لے کر انسان تک ہر چیز کو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں سے ہم آہنگ اور مربوط کرتے ہیں۔ اور انسانی اقدار کی روشنی میں ان کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے انہیں ایک انسانی معنویت عطا کرتے ہیں۔ یہاں ان کی نظم ''اسرارِ عالم'' کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ جہاں اکبر بارکزئی نے محض اشیاء کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ اس سے وابستہ حسیات کو ایک ایسے انداز میں پیش کیا ہے۔ جہاں نہ صرف احساس چیزوں سے زیادہ ٹھوس بن کر نمایاں ہوا ہے۔ بلکہ احساس ہی چیزوں کو اصلیت اور حقیقت بخشتا ہوا نظر آتا ہے۔

جوئس کے بقول ''چیزوں کی مدد کے بغیر احساس ممکن نہیں لہذا چیزیں بھی اتنی اہمیت رکھتی ہیں جتنی شعور۔'' اکبر بارکزئی نے بھی اپنے احساس حسن کا اظہار اسی زمین اور اسی زمین سے وابستہ چیزوں کے ذریعے سے کیا ہے۔

کیا کوہ ودمن بھی مسکراتے ہیں؟
ہوا کو بھوک لگتی ہے
گھٹائیں سمجھ رکھتی ہیں
چیونٹیاں نہاتی ہیں
کیا رنگ بھی سانس لیتے ہیں

پھول بھی دیکھ سکتا ہے

کیا سورج کو پیاس لگتی ہے

نہ جانے آگ کو حمل بھی ہوتا ہے۔

(اسرارِ عالم) (۱۲۱)

کیا پانی بھی خواب کے تار و پود بنتا ہے۔

نہ جانے سنگ اور پتھر بھی

بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے عمل سے گزرتے ہیں۔

کیا مرغ و ماہی بھی شعر لکھتے ہے۔

کیا ایسی دیوار کسی نے دیکھی ہے۔

جو سن نہ سکتی ہو۔

نہ جانے مُردے دیکھ سکتے ہیں۔

ہم پہ ہنستے ہیں۔

نہ جانے روز و شب قوت گویائی بھی رکھتے ہیں۔

گریہ وزاری بھی کرتے ہیں۔

کیا یہ پیڑ اور گل شادی بیاہ بھی کرتے ہیں۔

کیا ندی نالے، چشمے اور دریا

لذت درد و غم سے آشنا بھی ہیں۔

کیا ستارے اور کہکشاں دیکھ اور سن بھی سکتے ہیں۔

نہ جانے زہرہ و مریخ محبت بھی کرتے ہیں۔

شعر و شاعری بھی کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔نہ جانے کتنے ہیں جو فہم رکھتے ہیں۔

برسر پیکار رہتے ہیں۔

نہ جانے، کون جانے اسرار عالم کو اکبر کے اشعاروں کو۔

شیکسپیئر نے ایک جگہ کہا تھا کہ ''انسانوں کو تیز روندیوں سے پیغامات مل سکتے ہیں۔ اور پتھروں سے وعظ سنائی دے سکتے ہیں۔'' اکبر بارکزئی نے اس احساس کو ایک حقیقت عطا کی۔ اور اس نے یہاں ابدی صداقتوں اور لازوال حقیقتوں کی ترجمانی ایسی چیزوں کے ذریعے سے کی کہ جس کے لئے ایک بڑے اونچے سطح کی ادارک کی ضرورت ہے۔

اکبر بارکزئی مرکزئی نظریہ کے شاعر ہیں۔ وہ زندگی کو ایک عہد، ایک علاقہ، ایک نسل اور ایک مخصوص اور محدود نظریہ کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے اسے اس کی کلیت میں دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی، انسانی تہذیب اور اور عصر کا شعور انسان کے اجتماعی دانش و عمل کا نتیجہ ہیں۔

ان کی مشہور نظم ''سورج کو کون قتل کر سکتا ہے'' اسی سوچ و ادراک کا مظہر ہے۔ جہاں انہوں نے تاریخی سطح پر تاریکی اور روشنی، رات اور دن کی علامتوں کے ذریعے شعور و آگہی اور بے علمی و جہالت کے تضاد اور کشمکش کو اجاگر کیا ہے۔

اکبر بارکزئی کے نزدیک ''سورج'' انسانی شعور و آگہی کی علامت بھی ہے

اور زندگی کی ابدیت کی گواہی بھی۔ وہ انسانی شعور کو سورج سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شعور تو روشنی ہے۔ جسے نہ تو قتل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی پابند سلاسل کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح روشنی کو زنجیریں پہنائی نہیں جاسکتیں۔ اس طرح شعور پر پہرے بٹھائے نہیں جاسکتے۔ کیونکہ سورج کی کرنوں کو روکنے کے لئے لاکھ دیواریں کھڑی کی جائیں۔ لیکن روشنی اپنا راستہ بنانا جانتی ہے۔ اسی طرح انسان کو قتل کیا جاسکتا ہے اسے سولی پہ لٹکایا جاسکتا ہے۔ مگر اس کی شعور اور سوچ کو پابند نہیں کیا جاسکتا۔

برنارڈ شا نے بھی کہا تھا کہ ''انسان کو قتل کیا جاسکتا ہے۔ اس کو پابند سلاسل کیا جاسکتا ہے۔ اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کی سوچ اور فکر پر کوئی قدغن لگایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ شعور کی مثال درخت کی سی ہے۔ جس کی شاخوں اور ٹہنیوں کو جتنا بھی کاٹ دیا جائے۔ مگر اس کی جڑیں زمین میں اتنی ہی گہرائی میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔ انسانوں کو قتل کرنے کے بعد اس کی سوچ و محسوسات بھی درخت کی جڑوں کی طرح نامحسوس طریقے سے لوگوں کے دلوں میں نفوذ کر جاتی ہیں۔''

اکبر بارکزئی اپنی اس نظم میں کہتے ہیں کہ جہالت اور پس ماندگی کی کریہہ رات لاکھ طویل ہی کیوں نہ ہو مگر سچ اور شعور کی سورج کو بہر حال طلوع ہونا ہے۔ اکبر بارکزئی کے نزدیک رجعت پرست اور ظلمت پسند قوتوں کی مثال اس چمگادڑ کی طرح ہے۔ جو روشنی کو Face نہیں کر سکتے۔ کیونکہ روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اس لئے جب بھی رات کی تاریکی چھا جاتی ہے تو وہ یہی سمجھنے لگتا ہے کہ اب سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا۔ مگر یہ اس کی کم فہمی اور کج فہمی ہے۔ سورج کو تو بہر حال

طلوع ہونا ہے۔

اکبر بارکزئی رجعت پرست قوتوں کی سوچ کو بھی چمگادڑ کی سوچ کے مماثل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کو Face کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جبر، جہالت اور بے علمی کی سیاہ رات یونہی جاری وساری رہے گی۔ لیکن یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ کیونکہ انسانی سوچ کے ارتقاء کو روکا نہیں جا سکتا۔

مار ڈالے جو سورج کو اور آگہی کو مقید کرے
کوئی ایسا نہیں جراتوں کا امین
تیغ زن سورما
رات کے دشت میں محو رقصاں رہے
اور ہنستے رہے
بھولے چمگادڑ مگر
جانتے تک نہ تھے
رات ڈھل جائے گی
مست وجلوہ وفشاں دن نکل آئے گا۔

(اکبر بارکزئی/ اللہ بشک بزدار) (۱۲۲)

اس طرح کی ایک خوبصورت اور بظاہر سادہ مگر انتہائی گہری معنویت کے حامل اردو نظم میں رجعت پرست قوتوں کی شکست اور پسپائی کو تین الوؤں کی گفتگو کے

ذریعے انتہائی اچھوتے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ الو بھی چمگاڈروں کی طرح سورج کی روشنی کو Face نہیں کر سکتے۔ کونکہ سورج تو انہی کے لئے چمکتا ہے کہ جن کی آنکھوں کو اسے دیکھنے کی ہمت اور سکت ہوتی ہے۔

کل رات جنگل میں
تین الو اداس بیٹھے تھے
ایک نے کہا کہ رات لمبی ہے
دوسرے نے کہا کہ رات چھوٹی ہے
تیسری نے کہا کہ چھوڑو یار
رات لمبی ہو یا کہ چھوٹی ہو
صبح صادق ضرور ہونا ہے
ہم کو اندھا ضرور ہونا ہے۔

زندگی ایک نامیاتی (Organic) حقیقت ہے جو برابر بدلتا اور سنورتا اور ارتقا پذیر رہتا ہے۔ زندگی ماضی کے نسبت زیادہ حسین، بہتر اور مکمل ہوتی جاتی ہے۔ انسانی سوچ و شعور کا سفر بھی زندگی سے عبارت ہے۔ زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ شعور بھی بڑھتا رہتا ہے۔ اکبر بارکزئی کی ایک دوسری نظم ''تاریخ'' میں بھی عصر کا شعور اور زندگی کے امر ہونے کا احساس نمایاں ہے۔

میں زندہ رہوں گا، میری سوچ زندہ رہے گی
تاریکیاں مٹ کر رہیں گی

تاریکیوں کے باسی، یہ جرار لشکر
دفن ہو کر رہیں گے
میں حق و آزادی کی روح ہوں، زندگی ہوں
میں تاریخ ہوں، روح عصر ہوں
بلوچ فرزند ہوں، آدم کی اولاد ہوں
میں امر ہوں
امر ہی رہوں گا۔ (تاریخ) (۱۲۳)

ویت نام انسانی جدوجہد اور آزادی کا ایک استعارہ ہے۔ ویٹ کونگوں کی بہادری، ان کی جدوجہد انسانی تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ ہی نہیں بلکہ پوری انسانی جدوجہد کا حوالہ بھی ہے۔ اکبر بارکزئی نے اپنی نظم ''ویٹ کونگ'' میں ویٹ کونگوں کی جدوجہد اور ان کی جرات کو نہ صرف خراج تحسین پیش کیا ہے بلکہ یہاں ان کا احساس غیر جغرافیائی، غیر تاریخی رشتوں میں جذب ہو کر نئی معنویت کا سبب بنا ہے۔ ورڈز ورتھ نے کہا تھا کہ ''جب تک انسان اپنے وجود، اپنی ہستی کو وسعت نہیں دے گا۔ تب تک اس کی معنویت پوری طرح اجاگر نہیں ہو سکتی۔'' (۱۲۴) ویٹ کونگ میں اکبر بارکزئی کی سوچ ایک مخصوص فرد کی سوچ کی بجائے ساری کائنات کی سوچ ادراک میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

میں ویٹ کونگ ہوں
میں آسماں ہوں

زمیں ہوں

زندگی ہوں

میں ویٹ کونگ ہوں

میں افریقا ہوں

ایشیاء ہوں

یورپ ہوں

میں بنی نوع انساں ہوں (ویٹ گونگ) (۱۲۵)

جب سے انسان نے پہلی بار اس دنیا اپنی آنکھیں کھولیں تو اسے بہت سے نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اپنی زندگی کی بقاو تحفظ اور اپنی ذات کی بازیافت (Discorery of Self) کے ساتھ ساتھ کائنات کے بہت سارے رموز واسرار کے ادارک کا مسئلہ بھی ان کے لئے ایک اہم سوال بنا رہا۔

انسان اپنے ارتقائی سفر میں اپنی اجتماعی تجربات اور محدود علم و دانش کے حوالے سے بہت سے اسرار ورموز کے بارے میں بتدریج آگہی کے مراحل طے کرتا رہا۔ مگر اپنی ہستی اور وجود کے سوال کے ساتھ ساتھ کائنات اور اس کے مظاہر کے بارے میں ان کا شعور وادراک اپنے ماحول اور حالات کے ارتقاء کے باعث نہ صرف ہمیشہ بدلتا رہا بلکہ نامکمل ہی رہا۔'' (۱۲۶)

انسانی رشتوں، عقائد وخیالات اور نظام اقدار کے توڑ پھوڑ کے باعث انسان کے وجود اور ہستی کا سوال، زندگی کے مستقبل کا تصور اور انسانی مقدر کا سوال

ایک بار پھر بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ اکبر بارکزئی کی نظم ''نوکیں دورءِ نوکیں انسان'' (نئے دور کا نیا انسان) اسی سوال کا احاطہ کرتا ہے۔

اک آواز دائم مجھ سے یہ سوال کرتا ہے؟

کہ تم کون ہو؟

میں کون ہوں؟

میں ''میں'' ہوں!

اس جواب سے میرا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ (۱۲۷)

اکبر بارکزئی کے ہاں انسان کی پرت در پرت بلکہ لخت لخت انسانی کردار و تضاد ایک ایسا معاشرتی المیہ ہے کہ جہاں انسان مقام آدمیت اور شرفِ انسانیت کی سطح سے پھسل کر اخلاقی پستیوں کی عمیق گہرائیوں میں دھنس چکا ہے۔ ان کے نزدیک یوں تو ہر انسان، انسانوں کا چہرہ لیے نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا باطن اس کا عمل اور اس کے کردار کی مثال بقول خلیل جبران اس کیڑے کی مانند ہے جو ابھی تک غاروں میں سے رینگتے ہوئے نظر آتا ہے۔

اس لیے اکبر بارکزئی یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آیا میں بھی انسان ہوں ؟اور یہاں ''میں'' کی بات ذاتی اور انفرادی سوال کی بجائے ایک اجتماعی اور نظریاتی سوال ہے۔ جو صرف ایک فرد کا المیہ ہی نہیں بلکہ پورے بنی نوع انسان کا المیہ ہے۔ اور یہ المیہ ایک طرف لخت لخت انسانی وجود کا پیرایہ اظہار بھی ہے اور دوسری طرف موجودہ صنعتی اور مادی عہد کی اجنبیت اور زوال پذیر سماجی قدروں کے تناظر میں

انسانی زندگی کے مختلف رویوں، صورتوں اور کرداروں کے تضاد کے درمیان جدید انسان کے وجود کی معنویت کی تلاش کا ایک عمل بھی ہے۔ حضرت بلھے شاہ نے بھی اس صورتحال کو بہت پہلے اپنے ہی انداز میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

؎ بلیھا کیہ جاناں میں کون؟

نہ میں مومن وچ مستیاں

نہ میں وچ کفر دی ریتاں

نہ میں موسیٰ نہ فرعون

بلیھا کیہ جاناں میں کون؟ (۱۲۸)

☆

اکبر بارکزئی کے ہاں انسان کے نامکمل ہونے کا احساس نمایاں ہے۔ ان کے نزدیک انسان نہایت ہی خوبصورت مگر ایک نغمہ ناتمام ہے۔ جسے بہر طور مکمل ہونا ہے۔ لیکن اس کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب سماج میں بدصورتی کی تمام وضعیں چاہے وہ نسلی اور لسانی تعصب کی شکل میں ہوں۔ طبقاتی جبر و فرق، عدم مساوات اور عدم برابری کے شکل میں ہوں، ختم ہوں۔ اور انسان اشرف المخلوق کی حیثیت سے سماج میں اپنی ذمہ داری اور مقام و مرتبت کا تعین کرے۔

؎ خوبصورت انسان اک مدھر گیت ہے لیکن

یہ گیت اب تک ادھورا ہے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ یہ وہ گیت ہے جو ازل کی حکایت ہے۔

فنا سے ماورا اک زندہ روایت ہے۔

یہ شہکار ہے دست قدرت کا

اے کامل ہی ہونا ہے

اسے دائم ہی رہنا ہے۔ (ناتوامیں سوت)(۱۲۹)

☆

زندگی تب ہی بامعنی اور بامقصد ہوسکتی ہے۔ جب انسان اپنے وجود اور ہستی کو کائنات کے وسیع تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے، جھوٹی انا، فاشزم ،اور چھوٹے خواہشات، مصلحت و مفادات کے چکروں سے خود کو آزاد کرے۔ اکبر بارکزئی اپنی نظم (بیات وتا آزات کنیں) یعنی ''آؤ خود کو آزاد کریں'' میں فرد کو اندر کے انسان سے لڑنے اور متصادم ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس وقت تک ہماری لڑائی بے مقصد اور بے سمت ہے۔ جب تک کہ ہم خود کو ذاتی خواہشوں، جھوٹ، منافقت، تعصب، ریاکاری، تنگ نظری، انا پرستی اور فسطائی جسے رویوں سے الگ نہیں کرتے۔

جمہور کی آزادی سے پہلے

آؤ خود کو آزاد کریں۔

ھم کہ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔

ہم کہ مصلحتوں کے شکار ہیں۔

ہم کہ جھوٹ کے اوتار ہیں۔

ہم کہ صدیوں سے نفرتوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔
ہم کہ اپنی جھوٹی انا کے قیدی ہیں۔
جمہور کو کیسے آزاد کریں گے ہم۔ (۱۳۰)

☆

لیکن آزادی کے لیے مکالمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔جس سوسائٹی میں مکالمہ کی آزادی ہے۔تنقیدی اور خود تنقیدی کا عمل موجود ہے۔وہاں فاشزم،ڈکٹیٹرازم ،غلامی ،جہالت ،منافقت ،کرپشن ،ذہنی کجروی ،سماجی و معاشرتی بے راہروی،ناانصافی حاوی نہیں ہوسکتا۔فیض احمد فیض کی نظم ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے) کی طرح اکبر بارکزئی بھی ڈائیلاگ ،مکالمہ یا بولنے کے عمل کو آزادی کا بنیادی خاصہ تصور کرتے ہیں۔ان کے بقول لفظ ہی وہ صورت ہے۔ جو انسان کو آزادی عطا کرتا ہے۔اور لفظ ہی حیات کی ابتداء وانتہا ہے۔

لفظ ابتدائے حیات
لفظ انتہائے حیات
لفظ وحرف کے پیغمبر کو صد درود وسلام
لفظ ہستی کا نقش ازل
لفظ روحِ عصر
لفظ رہنمائے دہر
لفظ پروردگار

لفظ شہر پناہ

لفظ کوہ ندا

لفظ آزاد کرتا ہے انسان کو

لفظ برباد کرتا ہے انسان کو

لفظ کو جرات اظہار دو

لفظ کو سلیقہ اظہار دو

لفظ آزادی کی تعبیر ہے

لفظ زندگی کی تفسیر ہے۔ (لبز) (۱۳۱)

☆

ملک طوقی

ملک طوقی نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر نظمیں ایک دانشور کی لکھی ہوئی نظمیں ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبہ سے زیادہ تعقلات کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ مزاجاً فکری رجحان کے مالک ہیں۔ فکری مزاج کے باعث ان کے اسلوب میں بھی ایک سوچ اور فکر نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اپنی شاعری میں کسی فلسفیانہ پیچیدگی اور منطقی موشگافیوں کا سہارا لئے بغیر اپنی طبیعت میں شعری وژن کے رچاؤ کے باعث اپنی فکر میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔

ملک طوقی کا لہجہ اور ان کی شاعری کا اسلوب مکالماتی ہے۔ وہ اپنے خیالات و تصورات کو سیدھے سادھے انداز میں مکالمے کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ اور اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ ہمارے سامنے بیٹھے کوئی کہانی سنا رہے ہیں۔ مگر ان کے بیان کرنے کا انداز واقعیت نگاری کی بجائے علامتی اور استعاراتی پیرایہ اظہار کی حامل ہے۔ کلاسیکی شاعری کا انداز بھی مکالماتی تھا۔ لیکن ملک طوقی کے مکالماتی انداز میں ایک دانشور کی سوچ اور فکر نمایاں ہے۔

ان کی سوچ و ادراک کی سطح اور خیالات کا پھیلاؤ جہاں ایک طرف وسیع

اور بلند تر ہے۔ دوسری طرف سمجھنے میں آسان اور عام فہم بھی ہے۔ وہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ خیال کو کہانی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ اور ان کی پرت در پرت تہوں اور گرہوں کو ایک ایک کر کے کھولتے جاتے ہیں۔

ملک طوقی کے ہاں اپنی سرزمین سے محبت، اپنی جڑوں کی تلاش، اپنی روایت اور ثقافتی سرمایے پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ پورے بنی نوع انسان سے محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔ اور یہی جذبہ اور احساس ان کی شاعری کا مرکزی اور بنیادی حوالہ ہے۔ ''وہ انسان کو اپنی شاعری کا مرکزی نقطہ قرار دیتے ہوئے ایک ایسے سماج کی تخلیق پر زور دیتے ہیں۔ جہاں ظلم و زیادتی، جبر و استحصال، ناانصافی، غربت، جہالت، غلامی اور غلامانہ اقدار کے برعکس آزادی، امن، انصاف اور خوشحالی سمیت تمام بنی نوع انساں کو بلا کسی فرق و امتیاز کے اپنا وجود، اپنی ہستی، زبان و ادب اور تہذیبی و ثقافتی سرمایہ سے محبت کرنے کا حق میسر ہو۔'' (۱۳۲)

یہاں ان کی نظم (Post Existentialism) کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

مشرقی اقوام کے شانہ بشانہ
محکوم لوگوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
ایک جانب میں
خوبصورت اور روشن مستقبل کے
سہانے خواب بنتا ہوں

کہ خوشحالی و آزادی

شعور و روشنی

ہماری زندگی کا اک دائم حوالہ ہو

بنی نوع انساں کے سبھی حوالے

سبھی پہچان

دھنک کی خوبصورت رنگوں کی طرح مل کر

حسیں جذبوں کی آدرش کرلیں۔ (۱۳۳)

کہتے ہیں کہ ہر مستقبل کے شاعر کا مصلح ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف مستقبل کا خواب دیکھتا ہے بلکہ لوگوں کو اکساتا ہے کہ وہ اس خواب کو پورا کریں۔ اسی تناظر میں ملک طوقی کی یہ نظم جو شعور و ادراک کے حوالے سے ایک وسیع قومی اور بین الاقومی مفہوم رکھتا ہے۔ ''اس نظم میں جہاں وہ ایک طرف تنگ نظری، نسلی اور لسانی تعصبات و منافرت کی نفی کرتے ہوئے ایک عالمگیر انسانیت کا خواب دیکھتے ہیں۔ تو دوسری طرف اس نظم میں (بلکہ ہر نظم) میں وہ ایک کردار کے حوالے سے شریک نظر آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے شاعرانہ تجربے میں جس صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف اس صورتحال کو شدت سے محسوس کرتے ہیں بلکہ اپنی ذات کو بھی ان تجربات و محسوسات کا حصہ بناتے ہوئے خود کو ایک زندہ کردار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔'' (۱۳۴)

ملک طوقی نے اپنی شاعری میں اپنی تاریخ، شعری روایت اور اس کے

امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے جہاں اپنے عہد کی صورتحال کا معروضی تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہیں پہ انہوں نے لمحہ بہ لمحہ اور نو بہ نو بدلتی ہوئی کائنات میں انسانی مقدر اور اس کے مستقبل کے بارے میں نہایت ہی سنجیدگی سے غور و فکر کیا ہے۔

ملک طوقی انسانی مقدر کے سوال کو صرف لمحہ موجود کے حوالے سے دیکھنے کی بجائے اسے زندگی کی ابدیت کے تناظر میں دیکھتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کو ایک عہد اور ایک جہت تک محدود رکھنے کی بجائے اس کی کلیت اور ابدیت پر یقین رکھتے ہیں ۔ یہاں انکی نظم (Exsitentialism) ملاحظہ کیجیے۔

زندگی اک عذاب ہے مگر
اس کے بغیر بھی کچھ نہیں ہے۔
آؤ! اپنے چاند جیسے حسیں بیٹوں
اور گلبدن بیٹیوں کی خاطر
اک خوبصورت سحر تراشیں
ان عذابوں سے جاں چھڑا لیں
گر میں نہ ہوں گا
تو تم رہو گے
میری نسل کے جری سپوتو
ہم نہ ہوں گے
مگر زندگی تو تا ابد رہے گی

اے بلوچ فرزندو

زمین زادو

شرف آدمیت اور شعور و آگہی کی خاطر

نجاتِ رنج و محن کی خاطر

آؤ! اس کرہ ارض کو

خلد بریں بنالیں

کہ اس کے بغیر کوئی راستہ نہیں ہے۔ (۱۳۵)

ملک طوقی کی یہ نظم سنسکرت کے اس مشہور اشلوک کی طرح کہ

میں کسی کا نہیں ہوں

میں سب کا ہوں

تم یہاں آنے سے پہلے بھی یہیں تھے

اور یہاں سے جانے کے بعد بھی یہیں رہو گے۔

مستقبل کے انسان کا حقائق نامہ ہے جس میں زمانے کی ابدیت اور زندگی کے امر ہونے کا احساس نمایاں ہے۔ ان کے ہاں انسانی تقدیر اور اس کے مستقبل کا سوال محض جذباتی نعرے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ان کے یہاں پوری ذمہ داری کا احساس ہے۔ اس لئے وہ دائمی امن، عدل، صداقت اور جاودانیت کی بات کرتے ہیں۔ وہ بنی نوع انساں کی آزادی کے وجود کو منوانے کی خواہاں ہیں۔ اور اسے ایک لازوال اور برتر حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ بلوچ قوم کی مستقبل کو بھی انسانی

مستقبل اور تقدیر کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک بلوچ قوم کی فلاح اور خوشحالی کا راز مجموعی انسانی بقا، عالمی امن اور خوشحالی میں مضمر ہے۔ ساحر لدھیانوی نے بھی ایک جگہ انسانی مستقبل کی خوشحال اور پرمسرت زندگی کے حصول کے لیے ایک خواب بُننے کی بات کی تھی۔

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے غم ناک درد کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکیں۔

لیکن ساحر لدھیانوی کے خواب بننے کے برعکس ملک طوقی ایک خوبصورت سحر تراشنے پر زور دیتے ہیں۔ ساحر کے خواب کی طرح ملک طوقی کی آرزوئے سحر بھی انسانی تقدیر کے حوالے سے ایک ایسا بنیادی سوال ہے جس کا حل صرف اور صرف عالمی اجتماعیت، عالمی امن اور عالمی احساس میں پنہاں ہے۔

بشیر بیدار

بشیر بیدار ساٹھ کی دہائی کے آخری سالوں اور ستر کے شروع میں اپنے عہد کی نئی نسل کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان کا نہایت ہی سہل اور سادہ مگر پر تاثیر لہجہ جلد ہی ان کی عوامی مقبولیت کا سبب بنا۔

بشیر بیدار بنیادی طور پر مانوس اور جذبوں اور مانوس زبان کے شاعر ہیں۔ عام انسانوں کے مانوس جذبوں، آرزوں اور امنگوں کو مانوس پیرائے میں بیان کرنے اور عوام سے براہ راست مکالمہ کرنے کا ہنر جاننے کے سبب وہ بلوچی شاعری میں اپنے لیے ایک نئی راہ متعین کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں احساس کی بے پناہ شدت کے ساتھ ساتھ جذبے کا خلوص اور سچائی نمایاں ہے۔ اس لیے ان کی شاعری براہ راست دل پر اثر کرتی ہے۔

بشیر بیدار کی شاعری ایک ایسے مکالمہ ہے جہاں وہ ایک طرف اپنی ذات سے ہم کلام ہوتے نظر آتے ہیں۔ تو دوسری طرف اپنے سماج کے بے بس اور بے

زبان انسانوں سے ان کے دل کی بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے طرز تکلم میں انفرادی سطح پر ان کی ذات کے کرب واضطراب کا حوالہ بھی ہے۔ اور اجتماعی سطح پر پوری انسانیت کا دکھ بھی نمایاں ہے۔ ان کی انفرادی اور ذاتی سطح تو معمول اور روزمرہ کے معاملات حسن وعشق کی سطح ہے۔ لیکن اجتماعی سطح پر اس کا یہ طرز احساس اپنے عہد کے آشوب کی نمائندگی کرتا ہے۔

"بیدار کی شاعری درد کی شاعری ہے۔ بنی نوع انسان کے کرب کی شاعری ہے۔ زندگی کا درد، اجتماع کا درد، مہربان ماں اور بلوچستان کی بیوگی کا درد، صدو کے کرم خوردہ آٹوں اور آنسوؤں کا درد، بھائی کی لاش پر نوحہ کناں بہن کا درد، گرسنہ، برھنہ پا اور بے علم چرواہے کے نئے کا درد، نوری کے سرود کا ماتمی درد، دانشور، قلمکار کے احساس غلامی کا درد کج فہم اور شعور دشمن رہنما کے لوٹ کھسوٹ اور وطن دشمنی کے کردار کا درد، غلامی سے نجات خود اختیاری کی خواہش کا درد، بشیر کی شاعری کی پہلی سطح ہے جو انہی تجربوں سے ترتیب پاتا ہے جبکہ اس کی شاعری کا دوسری سطح ان کی ذات کے شعور اور ان کے عشق سے عبارت ہے۔" (۱۳۶)

اجتماع کے درد کے حوالے سے وہ اپنی شاعری میں مختلف داخلی اور خارجی جبر کے ہاتھ کو یکساں طور پر بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں یہ جبر خارجی دباؤ اور تناؤ کا شاخسانہ نظر آتا ہے اور کہیں یہ جبر بلوچستان کے اپنے نام نہاد قیادت کی بے عملی، بے حسی، جھوٹ، فریب اور ریاکاری کا نتیجہ ہے۔ جس کے سبب بلوچستان کے مفلوک الحال عوام مدتوں سے ظلم کی چکی میں پستے دکھائی دیتے ہیں۔ باشعور

شاعر ہونے کے اعتبار سے وہ ہر حادثہ اور ہر سانحہ پر کڑی نظر اور گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ اس لئے معمولی سے معمولی منظر بھی نہ صرف ان کی دور رس نظروں سے اوجھل ہونے نہیں پاتا بلکہ وہ اپنے عوام کو قدم قدم پر عصری سچائیوں اور زمینی حقائق سے آگاہ کرتے نظر آتے ہیں۔

؎ یہ بھیڑیوں کا عہد ہے
یہ ظالموں کا عہد ہے
کس کی رہبری چاہتے ہو تم
یہ رہزنوں کا عہد ہے۔ (شوانگ) (۱۳۷)

☆

؎ ظالم و جابروں سے
ہم نے حق و حساب مانگا تھا
مزدور و محنت کشوں کے لئے
نئی زندگی کا خواب مانگا تھا
اپنے دیس کے غریبوں کو
تیری سازشوں سے آگاہ کیا ہم نے
(تو) سرداروں کے مجاوروں نے
ایمان فروش شاعروں نے
الفاظ کے بازیگروں نے

آسماں سر پہ اٹھالیا۔ (گناہ) (۱۳۸)

بشیر بیدار یہ جانتے ہیں کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہی ہوتا ہے اور عوام کی طاقت کے بل بوتے پر ہی یہ رہنما دیوتاؤں کا روپ دھار بیٹھے ہیں۔ اور انہیں یقین ہے کہ جب کبھی ان کے وطن زادوں کو اپنی قوت اور طاقت کا ادراک ہو جائے گا تو یہ دیوتاریت کے گھروندوں کی طرح زمیں بوس ہو جائیں گے۔

تم کہ خود کو بدمست اور طاقت ور سمجھتے ہو
مگر اتنا جانتا ہوں کہ تم بہت بے بس ہو
اپنی زندگی کی بقا کے لئے
تم میرے خون پہ پلتے ہو۔ (واجبہ) (۱۳۹)

☆

ہر طرف ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں ہم
تم بے شک گردنوں کی فصل کٹتے رہو
قتل و غارتگری کرتے رہو
مگر تم کب تلک زندہ رہو گے
یونہی ظلم و ستم کرتے رہو گے۔ (پندل) (۱۴۰)

☆

کیسے پائمال کر سکو گے تم سر بلند پہاڑوں کو
بحر بیکراں کی روانی کو

چاند کی چاندنی کو

گل کی خوشبو کو۔ (واجہ) (۱۴۱)

ایک طرف جہاں بلوچستان کے عوام کی لاعلمی، کم فہمی، بے حسی اور لاتعلقی بیدار کو مسلسل کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ تو دوسری طرف خارجی حالات کا جبر مسلسل انہیں مضطرب اور پریشان کیئے رکھتا ہے۔ تو ہمیں ایک دردمند دل کی پکار سنائی دیتی ہے۔

اب تمیز روز و شب کہاں باقی

صبح و شام دونوں ہیں بے معنی

باد صبا ہو یا کہ صرصر ہو

سبھی ایک جیسے ہیں۔ (گشنت) (۱۴۲)

اس صورتحال سے متعلق یہاں ان کی غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجیئے۔

اپنے عہد کا سقراط دربدر ہے آج

جھوٹ کا فرعون معتبر ہے آج

اندھوں کے ہاتھ میں اہل بصیرت کی رہنمائی ہے

بے خبر اپنے عہد کا دیدہ ور ہے آج۔ (۱۴۳)

لیکن اس بے یقینی کی صورتحال میں بھی وہ نہ صرف امید افروزی اور رجائیت پسندی کا دامن چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ اس بے یقینی کے پہلو بہ پہلو قدم قدم پر روشن سحر کی آرزو اور مستقبل کا ایک رومانوی تصور انہیں اپنی جانب کھینچتا نظر آتا ہے۔

خوشی کی خاطر آج ہم عذاب سہہ لیں گے
ظالموں سے اک دن حساب لے لیں گے۔
(۱۴۴)

☆

شب ہے اسی طرح تاریک
روشن سحر کی آرزو ہے وہی
وہی نوحے ہیں زندگی کے
دار و رسن کا سلسلہ ہے وہی
یہ قصہ ختم نہیں ہوتا
یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔
(پداچیر گیجاں) (۱۴۵)

بشیر بیدار نے اس تمام تر صورتحال کو اپنی دو نظموں "بام ءِ استار" (ستارۂ سحر) اور "چمانی ہر دگ رتلکنت" (آنکھوں کے روشن دیئے بجھ گئے) میں بڑی مراحت سے بیان کیا ہے۔ یہ دونوں نظمیں ان کی حیات افروزی اور ایک نئی صبح ظہور کی آرزوؤں کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

انکار، احتجاج، بغاوت، مزاحمت اور جدوجہد انسانی زندگی کا مستقل اور ناگزیر حوالہ ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر زندگی کے ارتقاء کا تصور ممکن نہیں۔ انسان نے شروع ہی سے اپنے ارتقائی سفر میں سمجھوتہ نہ کرنے کی بجائے قدم قدم پر حالات و خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ کائنات کی تسخیر اور اس کی سربستہ رازوں کا انکشاف، اپنی ذات کی پہچان اور بڑھتے اور چلتے رہنے کا تصور اور ولولہ ہی انسانی زندگی کی

ضمانت بنی رہی ۔اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سقراط سے لے کر منصور حلاج تک حضرت عیسیٰؑ سے لے کر حضرت امام حسینؓ تک سچ کی گواہی دینے والوں نے ظلمت اور موت کو شکست دے کر خرد پسندی اور حیات افروزی کی لو کو اونچا کئے رکھا۔ بشیر بیدار اپنی نظم طلب میں انہی عظیم روایات پر کاربند رہنے، انسانی کارگہ حیات میں جدوجہد کرنے۔آگے بڑھنے اور چلتے رہنے کے تصور پر یقین رکھتے ہیں۔

میں چلتا رہا اور بڑھتا رہا
بیکراں سمندروں کو پار کرتا رہا
میں بے راہ گھاٹیوں، چٹانوں
سر بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے گذرتا رہا
اور بڑھتا رہا
میں زیست کی جستجو میں
پل صراط پر سے گذرتا رہا
کٹھن آزمائشوں سے گذرتا رہا۔ (طلب) (۱۴۶)

اللہ بشک بزدار

پچاس کی دہائی میں بلوچی نظم میں جس فکری اور شعری روایت کی بنیاد آزات جمالدینی نے قائم کی تھی۔ عطا شاد، اکبر بارکزئی، ملک طوقی اور اس قبیل کے دیگر شعراء کے علاوہ اللہ بشک بزدار نے اس فکری روایت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا اور آگے بڑھایا ہے۔ وہ ستر کی دہائی کے وسط میں اپنے نرم و ملائم اور کومل لہجے کے ساتھ نئی نظم میں وارد ہوئے۔ فیض احمد فیض کی طرح ریشمی لفظوں میں لپٹا ہوا ان کے خوبصورت لہجہ نے نہ صرف بلوچی نظم کے پیرایہائے اظہار کو نئی صورت گری سے آشنا کیا۔ بلکہ موضوع اور مواد ہر دو اعتبار سے انہوں نے نئے تجربات کر کے بلوچی شاعری میں بے پناہ وسعت اور تنوع پیدا کی۔

انہوں نے آزاد نظم کے حوالے سے پہلے سے ڈھلی ڈھلائی تشبیہات علامات و استعارات کی بجائے ذاتی مشاہدے اور فکر و احساس کو ایک نئے اور

اچھوتے انداز میں پیش کیا۔ بزدار نے لفظ کو محض اظہار کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنے کی بجائے الفاظ کی باہمی رشتوں کو وسعت دیتے ہوئے اسکا دائرہ اثر اور اس کی معنویت میں ایک جذباتی ردعمل پیدا کی۔ الفاظ پر ان کی جذباتی گرفت، ترتیب و تنظیم، موسیقیت و غنائیت اور شاعرانہ فکر و خیال کے باعث ان کی شاعری عصری آوازوں میں نمایاں اور منفرد شناخت بنانے میں کامیاب رہی۔

بزدار کے ہاں رومانیت ایک مستقل رنگ لیے ہے۔ مگر ان کا تصور عشق اور ان کے داخل سے پھوٹا ہوا ان کی محبت عشق کا ایک ایسا استعارہ ہے۔ جو کبھی لیلائے وطن کا روپ دھارتا نظر آتا ہے۔ اور کبھی انقلاب کے حسیں تصور میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ جا بجا کبھی محبوب کو مرکز بنا کر وطن کو اس کے روپ میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اور کبھی وطن کو محبوب کے قالب میں ڈھالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں وطن اور محبوب دو ایسے مستقل حوالے ہیں، جہاں وہ ان سے سوچ اور ادراک کی ایک بلند تر سطح پر مسلسل اور تواتر کے ساتھ مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اللہ بشک بزدار کے نزدیک وطن اور محبوب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ایک ہی فکر کے دو دھارے ہیں اور یہ دونوں سطحیں اپنی علیحدہ شناخت اور پہچان کے باوجود تخلیقی اور فکری سطح پر جڑے نظر آتے ہیں۔

بزدار ایک جگہ کہتے ہیں۔

؎ غم وطن ہو یا غم جاناں
ایک ہی دکھ کے دو نام ہیں دونوں

جو قہر بن کر مجھ پر عذاب ڈھاتے ہیں۔(شیشغ)(۱۴۷)

فراق نے ایک جگہ کہا تھا کہ عاشق اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ تہذیب کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔اسے اپنے ہاتھوں سے نہیں کلچر کے ہاتھوں چھوتا ہے۔یہی بات بزدار کی شاعری پر پوری طرح صادق آتی ہے۔وہ اپنی چاہت کے معاملے میں اپنے محبوب کو وطن اور اس کی تہذیب کا مظہر سمجھ کر اس سے محبت کرتے ہیں۔اس کے گن گاتے ہیں۔اسکی بلائیں لیتے ہیں۔محبوب کی کافرادائوں،شوخیوں اور اٹھکیلیوں سے متاثر ہونے کے برعکس وہ اپنے محبوب سے صرف اس لیے محبت کرتے ہیں کہ ان کی رعنائیوں میں وطن کا حسن جھلکتا ہے۔

ھمکو مار ڈالا

نہ تیرے سرو بالا قد و قامت نے

تیرے نین نقشوں نے

جوانی نے،سحر انگیز باتوں نے

حنائی ہاتھوں نے

تیری صورت گری میں اے جاناں

وطن کا رنگ جھلکتا ہے۔ (تھراگاڑت)(۱۴۸)

☆

وطن بزدار کی شاعری کا بنیادی اور مرکزی نکتہ ہے۔پابلو نیرودا کی طرح ان کے یہاں بھی محبوب کی محبت وطن کی محبت میں ڈھل کر ایک زندہ استعارے کی صورت

اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے وطن اور وطن زادوں کی زبوں حالی ،پس ماندگی، بے بسی اور بے چارگی کا دکھ بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ وہ اپنی مشہور نظم ''لیلائے وطن'' میں اپنے وطن سے مخاطب ہوکر اپنے عہد کی تلخیوں اور محرومیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے لیلائے وطن
تو نے دیکھا تیرے جانثاروں نے
اپنا عہدِ وفا پورا کیا
تیری حسیں مرغزاروں، آبشاروں
کہساروں، دھنک رنگ موسموں کو
دستِ جفا سے بچانے کے لیے
تیرے شیدائی اپنی جوانی وار کر
زندگی تجھ پہ نچھاور کر گئے
تیری خاطر کٹ گئے، مر مٹ گئے۔
اے لیلائے وطن!
پھر بھی گر تیرے عاشقوں پر کوئی تہمت لگے
یا کوئی الزام وجہِ ملامت بنے
ہمیں تمھاری قسم!
ہماری ناکامی کا سبب

تیرے وہ بیٹے ہیں۔

اے لیلائے وطن

ہمیں تمہاری قسم!

ہماری ناکامی کا سبب

تیرے وہ بیٹے ہیں۔

جنہوں نے لالچ حرص وہوس میں

یا اپنی جھوٹی شرافت کے بھرم میں

تیری ہواؤں، موسموں، رنگوں کی حرمت بیچ دی

یا عقل سے بے بہرہ وہ ناداں لوگ ہیں

کہ جن کے لبوں پر اغیار کے فسانے ہیں

ہزار داغ ہیں ہزار زخم ہیں دل میں مرے

تیرے غم میں یوں جلے ہیں ہم

کہ اب ہماری رگوں سے کوئی لہو نہیں رستا

چشم نم سے کوئی آنسو نہیں گرتا

جاں بہ لب، ہم خستہ تن

استخواں کے ڈھانچے ہیں۔

بس زندہ لاشیں ہیں۔

تجھی کو یاد کرتے ہیں۔

سرد آہیں بھرتے ہیں
کف افسوس ملتے ہیں۔ (لیلائے وطن)(۱۴۹)

☆

اللہ بشک بزدار کی شاعری میں وطن اور وطن زادوں کی زبوں حالی ،درماندگی کی جس سانحے کی تصویر کشی کی گئی ہے اس میں خارجی عوامل کے اثرات سمیت بلوچستان کی داخلی صورتحال کی بے عملی اور بے سمتی کی عکاسی بھی ملتی ہے۔وہ میر گل خان نصیر سے مخاطب ہوکر اپنے عہد کا سانحہ یوں بیان کرتے ہیں۔

تو نے کیا کہا تھا ؟
میرے شاعر، سخن پرور!
یہی دکھ ہے کہ ہم اب تک کچھ نہیں سمجھے
تم نے کس لیے قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں
ستم کاٹے تج دی زندگی اپنی
کس کی ویران آنکھوں نے ، اندھیروں نے
تیری آنکھوں میں زمانے بھر کی بے چینیاں بھر دیں
پوہ کے یخ بستہ ہواؤں نے
تیرے بدن پر نہ جانے کتنے موسموں کی تلخیاں لکھ دیں۔
ھماری خاطر میرے شاعر!
تو نے ایک خوبصورت زندگی کا خواب دیکھا تھا۔

بہنوں کے لیے تو نے
دھنک کا ایک خوبصورت سائباں مانگا تھا۔
تاکہ دہر کی تلخیاں
اُن کے کومل چہروں پر دکھ کی تصویریں نہ بن جائیں
ماؤں کی دعائیں ، لوریاں نوحے نہ بن جائیں
تو نے چاہا تھا کہ
معصوم بچوں کی تختیاں ، قلم ، کاغذ
تلواریں نہ بن جائیں۔
دیارِ یار کے موسم،محبت کے ترانے
لہلاتے کھیت ، آبشاریں، مرغزاریں
جذبے، حرتیں، ارماں
دکھ درد کی تحریریں نہ بن جائیں
میرے شاعر!
محروم انسانوں ، غریبوں کے لیے تو نے
زندگی کا ایک گیت مانگا تھا
حیات جاوداں کا ایک سنگیت مانگا تھا
تونے چاہا تھا
کہ اب کوئی نہ حیات کا مرثیہ لکھے

زیست کی محرومیوں کا کوئی نہ المیہ لکھے۔

میرے شاعر!

تو نے ہمیشہ صلیب دار سے دوستی رکھی
دہر کے پل صراطوں پر عظمت کی داستاں لکھی
مگر افسوس ہے، صد افسوس ہے
کہ ہم اب تک کچھ نہیں سمجھے
کہتے ہیں کہ تو نے
غریبوں کے لیے معتبر ہونے کا شرف مانگا تھا
اپنی دھرتی پر اپنے فرزندوں کے لیے
جینے کا حق مانگا تھا۔
بہنوں کے لیے تو نے
مرادوں کی دُعا کی تھی
تاکہ ان کے تقدس کی
کوئی بولی نہ لگ جائے۔

(گہیں شائر)(۱۵۰)

☆

گو کہ رومان بزدار کی شاعری کا بنیادی سطح ہے۔ مگر ان کے تصورات عشق میں جذباتیت کی بجائے ایک سلجھا ہوا انداز ملتا ہے۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی طرح

حسن و عشق کے روایتی تصور کو رد کرتے ہوئے حسن و عشق کے پس منظر میں انسانی سماج کے تشخص کو اجاگر کیا ہے۔ اس طرح ان کا تصور عشق ذات کی حد بندیوں سے نکل کر پورے بنی نوع انساں کی معصوم آرزوؤں اور امنگوں کی آواز بن جاتی ہے۔

بزدار انسانوں کو رنگ، نسل اور علاقائی حوالوں سے دیکھنے کی بجائے انسان بطور انسان ہی کی حیثیت میں دیکھنے کے قائل ہیں۔ اس لیے وہ نہ صرف معاشرتی اونچ نیچ اور طبقاتی جبر کے خلاف ہیں۔ بلکہ وہ طبقاتی جبر کے دکھ کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں بزدار انسانی سماج کے پس منظر میں جنم لینے والے طبقاتی تضاد کی کہانی کو پروپگنڈا، نعرہ یا کسی گہرے فلسفیانہ خیال کا سہارا لیے بغیر نہایت ہی نفیس اور لطیف ادبی پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

افلاس کے مارے ہوئے انسانوں کا
چہرہ خوبصورت نہیں ہوتا
ان کے ہاتھ خوبصورت نہیں ہوتے
ان کے آنسوؤں میں گرمی
خون میں سرخی
آواز میں جادو نہیں ہوتا۔ (ھمے مے عشق ءِ)(۱۵۱)

☆

اللہ بخش بزدار کی نظمیں اپنی داخلی کیفیت سے ترتیب پانے والے تجربوں ...یت انسانی اور عالمی کرب کے پس منظر سے جنم لیتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے اندر کے

کرب کو اجتماعی آشوب اور عالمی کرب کو آشوب ذات کے حوالے سے دیکھتے اور برتتے ہیں۔ بزدار جتنی شدت، خلوص اور دیانت کے ساتھ اپنا وطن اور وطن زادوں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اتنی شدت، خلوص اور سچائی سے پوری انسانیت کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بزدار کے یہاں انسان دوستی کا تصور محض ایک نقطہ نظر کے طور پر نہیں بلکہ بھر پور نظریاتی وابستگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہاں انکی نظم ''درد'' کے چند اقتباسات ملاحظہ کریں۔

درد صدیوں کا تعلق
درد عہدوں کا امین
درد دکھوں کا مداوا
درد زخموں کا علاج
درد یاروں کی امانت
درد عرفان حیات
درد شاعر کا مغنی
درد گرجا، پادری
درد پیغمبر، ولی و اولیاء
درد بھکشو، درد مسجد، خانقاہ
درد اجمیری و داتا گنج بخش

درد وید و درد گیتا

درد انجیل و قرآن

درد تلسی و کبیرا اور نانک کی زبان

درد حافظ، درد سعدی، درد غالب کا کلام۔

درد مُریدہان کی محبت درد فاضل درد دُرک کا بیان

درد بیورگ، توکلی و رحملی

درد سخندان علیہان، رحمن

درد خوشحال و فرید

درد وارث، درد بلھے درد سندھڑی کا لطیف

درد فیض کا ''نسخہ ہائے وفا کی

درد دھرتی کی محبت

درد گل خان و ایاز

درد دریاؤں کی روانی، آبشاروں کا حسن

درد بیبو، درد جھنڈی، درد ہک بہی کا پہاڑ

درد چلتن، درد بولان درد شہر جیونی

درد وہ رنگ لہو ہے

جس سے گلرنگ ہے ہماری سرزمین۔

مبارک قاضی

مبارک قاضی ایک باشعور شاعر ہونے کے اعتبار سے اپنے عہد کے تقاضوں اور سچائیوں کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ وہ حالات و واقعات کو تجزیہ کی دھار پر پرکھتے ہیں۔ وسعت نظری، مشاہدہ، احساس اور جذبہ کی شدت انکے فن کا بنیادی خاصہ ہے۔

ان کی شاعری کا بنیادی سطح رومان ہے۔ مگر وہ غزل کے عمومی مزاج کی طرح محض رومان کی خارجی سطح پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی غزلوں میں تاریخی، سماجی اور سیاسی شعور کی کئی کروٹیں دیکھنے میں ملتی ہیں۔ انہوں نے زندگی کی ترجمانی حسن و عشق کے فضاء میں رہ کر کی ہے۔ اور وہ حسن و عشق ہی کے ذریعے سے پوری دنیا کو دیکھتے، سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

ان کی شاعری میں بیک وقت انفرادی اور اجتماعی دونوں کیفیات شامل ہیں۔ مبارک قاضی کی شاعری مختلف لہجوں، آوازوں اور رنگوں کی شاعری ہے۔ اس میں رومانیت بھی ہے۔ اور انقلاب بھی، ذاتی دکھ بھی ہیں۔ اور اجتماع کا درد بھی،

نفسیاتی الجھنیں بھی ہیں اور معاشرتی پیچیدگیاں بھی۔ وہ زندگی کی تہہ میں اتر کر حقیقتوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ اور انہیں اپنے فن میں منعکس کرتے ہیں۔

مبارک قاضی غزل کے شاعر ہیں۔ گو کہ انہوں نے بہترین نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر غزل ہی ان کی پہچان ہے۔ ''غزل، فارسی اور اردو کی وساطت سے بلوچی میں داخل ہوئی اور اس صنف کو حقیقی معنوں میں مبارک قاضی نے ہی برتا ہے اور برت رہا ہے۔'' (۱۵۳)

''مبارک قاضی کی شاعری کا اپنا ایک رنگ اور سٹائل ہے۔ اپنے ڈکشن کے لئے لفظوں کا انتخاب اور ان کو ترتیب دینے کا اس کا اپنا ایک انداز ہے۔ ان کی تشبیہات واستعارات، علامات وتراکیب منفرد ہیں۔'' (۱۵۴)

گو کہ کسی حد تک مبارک قاضی کی شاعری پر عطا شاد کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مجموعی طور پر ان کا اپنا لہجہ ہے۔ جس سے انہوں نے اپنے آپ کو دریافت کیا ہے۔

''مبارک قاضی کی شاعری میں شعریت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں جتنی شعریت ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ وہ کسی دوسرے کے ہاں مشکل سے ملے گا۔ مبارک قاضی مختصر اور چھوٹی بحروں میں نہایت ہی خوبصورت اور پر مفہوم شعر کہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ خوبی صرف اور صرف ان کے ہاں نظر آتا ہے۔'' (۱۵۵)

مبارک قاضی کی شاعری میں سیاسی اور سماجی اشارات نمایاں ہیں۔ لیکن وہ سیاسی اور سماجی مسائل کو پروپگنڈا یا نعرے کے طور پر نہیں برتتے۔ بلکہ وہ اسے

استعاروں میں بیان کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی حقیقت نگاری علامتی روپ اختیار کرگئی ہے۔

عطا شاد کی طرح قاضی نے بھی لفظوں کے توڑ پھوڑ سمیت بلوچی شاعری میں نئی لفظیات، نئے تراکیب اور نئی لغت کا اضافہ کیا ہے۔ جوان کی فنی شعور کی پختگی کی دلالت کرتی ہیں۔ ''عطا شاد کے بعد حقیقی معنوں میں حسن بیان، اندرونی کرب، پختگی اور سب سے بڑھ کر حسیں پیرائیہ اظہار اسے ممتاز مقام دیتے ہیں۔'' (۱۵۶)

یہاں ذیل میں ان کے نمونہ کلام کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

مجھے ہزار بار صلیب پر لٹکا دو
جلا دو، دفن کر دو
مگر میں مر کر بھی
تہہ خاک ہو کر بھی
پھر سے جی اٹھوں گا
سچ کہوں گا۔ (گواچن) (۱۵۷)

☆

وطن رنگ ہے
وطن دھنک ہے
وطن بادِ نسیم صبح
وطن گلہائے رنگ و بو ہے

گر وطن نہیں ہے تو ہم نہ ہوں گے
گر وطن ہے تو ہم امر ہیں
امر رہیں گے۔ (وتن) (۱۵۸)

☆

دشت و بیاباں میں کوہ و دمن بکتے ہیں
قومیں بکتی ہیں وطن بکتے ہیں
سوداگروں نے ہر چیز کی بولی لگا رکھی ہے
بھائیوں کے ننگ مردوں کے زن بکتے ہیں
فقط اک نخلِ گل کی خاطر فریاد نہ کر بلبل
انسانوں کی دنیا میں تو چمن بکتے ہیں
گردشِ دنیا نہ جانے کیا رنگ لائے گی
اب رسم چلی ہے کہ مردوں کے کفن بکتے ہیں۔

(غزل) (۱۵۹)

حوالہ جات

۱۔گل خان نصیر، (سخن ہائے گفتنی) ھون ءِ گوانک، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۲۶

۲۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۲۷، ۲۸

۳۔نور محمد شیخ (پیش لفظ) ھون ءِ گوانک، میر گل خان نصیر، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۱۰، ۱۱

۴۔گل خان نصیر، گرند، مستونگ، قلات پبلشرز ۱۹۷۱ء ص ۸۸، ۸۹

۵۔گل خان نصیر، گرند، ص ۲۸

۶۔نور محمد شیخ (پیش لفظ) ھون ءِ گوانک، میر گل خان نصیر، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۱۰

۷۔گل خان نصیر، (سخن ہائے گفتنی) ھون ءِ گوانک، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۲۸ ، ۲۹

۸۔گل خان نصیر، ھون ءِ گوانک ص ۹۳

۹۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۶۱

۱۰۔حفیظ حسن آبادی، بے دروریں شائر نصیر، ماہنامہ بلوچی کوئٹہ، ج ۴ ش ۳، اگست ۱۹۹۲ء ص ۲۱

۱۱۔گل خان نصیر، ھون ءِ گوانک، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۷۰۔۷۱

۱۲۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۱۸۷

۱۳۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۹۱

۱۴۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۱۸۲

۱۵۔آغاز میر نصیر خان احمدزی بلوچ، میر گل خان نصیر بحیثیت مورخ۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان
ج ۲۷ ش ۹ دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۱۹

۱۶۔گل خان نصیر، گرند، مستونگ، قلات پبلشرز ۱۹۷۱ء ص ۱۱۱۔۱۱۳

۱۷۔گل خان نصیر (سخن ہائے گفتنی) ھون ءِ گوانک، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۲۷
۱۸۔میر غوث بخش بزنجو (پیش لفظ) گلگال، کراچی سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۹۳ء ص ۱۲
۱۹۔گل خان نصیر، گرند، مستونگ، قلات پبلیشرز ۱۹۷۱ء ص ۷۲، ۷۳
۲۰۔گل خان نصیر، ھون ءِ گوانک، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۲۰
۲۱۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۲۱
۲۲۔عبداللہ جان جمالدینی (بلوچی ادب) پاکستان معاشرہ اور ادب، کراچی، پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ کراچی ۱۹۹۸ء ص ۶۱، ۱۶۲
۲۳۔گل خان نصیر، (پیش لفظ) بلوچی عشقیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء ص ب
۲۴۔گل خان نصیر، (پیش لفظ) بلوچی عشقیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء ص ب
۲۵۔گل خان نصیر، شپ گروک، کراچی، بلوچی اکیڈمی ۱۹۶۴ء ص ۹۰
۲۶۔گل خان نصیر/ امداد نظامی (مترجم) سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ج ۵ ش ۱۹ سال ۱۹۹۲ء ص ۱۶۶
۲۷۔گل خان نصیر، شپ گروک، کراچی، بلوچی اکیڈمی ۱۹۶۴ء ص ۹۵، ۹۶
۲۸۔گل خان نصیر، گرند، مستونگ، قلات پبلشرز ۱۹۷۱ء ص ۷۸، ۷۹
۲۹۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۸۰
۳۰۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۹۰
۳۱۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۹۱
۳۲۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، میر گل خان نصیر کا کومٹ منٹ، سنگت کوئٹہ ج ۳ ش ۱ دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۴۳
۳۳۔گل خان نصیر، ھون ءِ گوانک، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۱۱۸
۳۴۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۱۹

۳۵۔گل خان نصیر، گرند، مستونگ، قلات پبلشرز ۱۹۷۱ء ص ۸۲

۳۶۔عبداللہ جان جمالدینی، میر گل خان نصیر۔صحافی، بلوچی دینا ملتان ج ۲۷ ش ۹ دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۳۰

۳۷۔گل خان نصیر، گرند، مستونگ، قلات پبلشرز ۱۹۷۱ ص ۱۶۱

۳۸۔شیما مجید، نعیم احسن (مرتبین) سارتر-ادب، وجودیت اور فلسفہ، لاہور، نگارشات میاں چیمبرز ص ۱۰۱

۳۹۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۰۱

۴۰۔انوار حسین صدیقی، حقیقی زندگی کی سچائیوں کا شاعر، میر گل خان نصیر=شخصیت، شاعری اور سیاست، کراچی عوامی ادبی انجمن ۱۹۹۳ء ص ۷۸

۴۱۔ شیخ نور محمد (مرتب) میر گل خان نصیر=شخصیت شاعری اور سیاست، کراچی، عوامی ادبی انجمن ص ۱۰۱ ، ۱۰۲

۴۲۔گل خان نصیر، شب گروک، کراچی، بلوچی اکیڈمی ۱۹۶۴ء ص ۱۰۹ ، ۱۱۰

۴۳۔گل خان نصیر، ھونءِ گوانک، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء ص ۱۳۱

۴۴۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۸۲

۴۵۔گل خان نصیر، شنبلاک، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۴ ص ۱۰۱

۴۶۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۸۳

۴۷۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۴۲ ، ۱۴۳

۴۸۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۶۲ ، ۱۶۵

۴۹۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۴۸ ، ۴۹

۵۰۔گل خان نصیر، گرند، مستونگ، قلات پبلشرز ۱۹۷۱ء ص ۴۳

۵۱۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۷۶ ، ۴۹

۵۲۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۵۷ ، ۵۸

۵۳۔عبداللہ جان جمالدینی (بلوچی ادب) ادبی جائزے، خالد اقبال یاسر (مرتب) اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۸۶ء ص ۴۰

۵۴۔روزنامہ امروز لاہور ۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء

۵۵۔آزات جمالدینی، رژن، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۵۸ء ص ۵۶

۵۶۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۶۷

۵۷۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۵۶ ۔ ۱۵۸

۵۸۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۶۵ ، ۶۶

۵۹(ا)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۹۰ ، ۹۲

۵۹۔(ب)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۰۸ ، ۱۱۲

۶۰۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۵۹

۶۱۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۵۷۔۵۹

۶۲۔کریم دشتی، شرگداری، کوئٹہ، زمانہ پرنٹنگ پریس ۱۹۶۳ء ص ۴۷

۶۳۔غلام فاروق بلوچ، نوکیں تام، کراچی، بلوچی لبزانکی دیوان ۱۹۸۵ء ص ۵۵

۶۴۔صبا دشتیاری، انگریں واہگ، کراچی، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۱۹۹۹ء ص ۹۰

۶۵۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۹۸

۶۶۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۲۱۶

۶۷۔سید ہاشمی، شکلیں شبجو، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۲۰

۶۸۔سید ہاشمی، پچکانیں سسا، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۵ء ص ۱۲

۶۹۔سید ہاشمی، تراپکنیں ترمپ، کراچی، انٹرنیشنل پریس ۱۹۶۵ء ص ۹۹

۷۰۔سید ہاشمی، پچکانیں سسا، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۵ء ص ۵۰

۷۱۔سید ہاشمی، شکلیں شجو، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۳۲

۷۲۔سید ہاشمی، سچکانیں سسا، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۵ء ص ۱۱۔۱۷

۷۳۔صبادشتیاری، انگریں واہگ، کراچی، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۱۹۹۹ء ص ۲۸ ، ۲۹

۷۴۔سید ہاشمی، انگروترونگل، کراچی (؟) ۱۹۶۲ء ص ۲۰۔۲۲

۷۵۔کریم دشتی، شرگداری، کوئٹہ زمانہ پرنٹنگ پریس ۱۹۶۳ء ص ۳۵

۷۶۔مراد ساحر، زرعِ مروارد، کوئٹہ، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن ۱۹۹۵ء ص ۳۹

۷۷۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ ص ۴۱

۷۸۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۴۴

۷۹۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۷۶

۸۰۔مراد ساحر، پاہار، کراچی، پاذل اکادمی ۱۹۷۰ء ص ۹۶

۸۱۔مراد ساحر، زرعِ مروارد، کوئٹہ، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن ۱۹۹۵ء ص ۳۴

۸۲۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۱۵۴

۸۳۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۸۳

۸۴۔مراد ساحر، پاہار، کراچی پاذل اکادمی ۱۹۷۰ء ص ۹۶

۸۵۔مراد ساحر، زرعِ مروارد، کوئٹہ، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن ۱۹۹۵ء ص ۶۲

۸۶۔مراد ساحر، زرعِ مروارد، کوئٹہ، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن ۱۹۹۵ء ص ۳۶

۸۷۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۵۵

۸۸۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۱۳۹

۸۹۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۹۵

۹۰۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۳۵

۹۱۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۸۰

۹۲۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۳۸

۹۳۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۳۲

۹۴۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۸۱

۹۵۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۳۴

۹۶۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۴۷

۹۷۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۴

۹۸۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۴

۹۹۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۳۵

۱۰۰۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۱۳۵

۱۰۱۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۴۷

۱۰۲۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۴۲

۱۰۳۔آغا گل، ''عطا شاد'' ماہنامہ سنگت کوئٹہ ج ۳ ش ۳ فروری ۲۰۰۰ء ص ۱۲

۱۰۴۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۲

۱۰۵۔عطا شاد، روچ گر، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۶ء ص ۳۹

۱۰۶۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۹۹

۱۰۷۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۵۹

۱۰۸۔عطا شاد، شپ سحار اندیم، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۶ء ص ۸۲

۱۰۹۔عطا شاد، کج انت زمین، بلوچی کوئٹہ ج ۱۱ ش ۱۲۴ دسمبر ۱۹۹۲ء سرورق

۱۱۰۔عطا شاد، روچ گر، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۶ء ص ۱۱۱

۱۱۱۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۷۸

۱۱۲۔عطا شاد، کج انت زمین، بلوچی کوئٹہ ج ۱۱ ش ۱۲۴ دسمبر ۱۹۹۴ء سرورق

۱۱۳۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔سرورق

۱۱۴۔عطا شاد، روچ گر، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۴ء ص ۴۸

۱۱۵۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۳۸

۱۱۶۔امرتا پریتم، ایک اداس کتاب، کراچی، استعارہ پبلیکیشنز ۱۹۸۷ء ص ۳۷

۱۱۷۔عطا شاد، روچ گر، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۶ء ص ۸۴

۱۱۸۔عطا شاد، شپ سحار اندیم، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۶ء ۸۴

۱۱۹۔ن۔م۔دانش، اکبر بارکزئی ابدمانیں شائر، بلوچی کوئٹہ ج ۶ ش ۸۲ اگست ۱۹۹۲ء ص ۸

۱۲۰۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۹

۱۲۱۔اکبر بارکزئی، روچا کئے کشت کنت، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۱۴۰

۱۲۲۔اکبر بارکزئی/اللہ بشک بزدار/(ترجمہ) روچا کئے کشت کنت، سہ ماہی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۲ء ص ۱۹۱

۱۲۳۔اکبر بارکزئی، روچا کئے کشت کنت، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۱۲۱

۱۲۴۔محمد حسن عسکری، جھلکیاں (حصہ اول)، لاہور مکتبہ الروایت (؟) ص ۲۵۶

۱۲۵۔اکبر بارکزئی، روچا کئے کشت کنت، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ۱۳۵

۱۲۶۔واحد بزدار، شاہیم، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۸ء ص ۱۷

۱۲۷۔اکبر بارکزئی، روچا کئے کشت کنت، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۱۴۵

۱۲۸۔میاں ظفر مقبول (مرتب) کلام حضرت بلھے شاہ، لاہور، مکتبہ دانیال ۲۰۰۰ء ص ۱۱۴

۱۲۹۔اکبر بارکزئی، روچا کئے کشت کنت، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۹۴

۱۳۰۔اکبر بارکزئی، بیاات وتا آزات کنیں، بلوچی لبزانک حب ج ۲ ش ۱۰ جولائی اگست ۱۹۹۱ء ص ۴۲

۱۳۱۔اکبر بارکزئی، روچا کئے گشت کنت، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۱۴۳

۱۳۲۔واحد بزدار، شاہیم، کوئٹہ، بلوچی، اکیڈمی ۱۹۹۸ء ص ۲۹

۱۳۳۔ملک طوقی، P.Exsitentialism، ماہنامہ آساپ کوئٹہ ج ۲ ش ۴،۵ جنوری/فروری ۱۹۹۴ء ص ۵۷

۱۳۴۔واحد بزدار، شاہیم، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۸ء ص ۳۱

۱۳۵۔ملک طوقی، Exsitentialism, سہ ماہی پاکستانی ادبیات اسلام آباد ج ۲ ش ۲ سال ۱۹۹۵ء ص ۱۴۷

۱۳۶۔امان اللہ گچکی (پیش لفظ) کریاب، بشیر بیدار، مسقط، بلوچ ادبی مجلس ۱۹۹۹ء ص ۱۰

۱۳۷۔بشیر بیدار، کریاب، مسقط، بلوچ ادبی مجلس ۱۹۹۹ء ص ۲۶

۱۳۸۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۳۵

۱۳۹۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص ۳۲

۱۴۰۔بشیر بیدار، ھرام، کراچی، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۹۰ء ص ۵۵

۱۴۱۔بشیر بیدار، کریاب، مسقط، بلوچ ادبی مجلس ۱۹۹۹ء ص ۳۲

۱۴۲۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۷۶

۱۴۳۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۶۱

۱۴۴۔بشیر بیدار، ھرام، کراچی، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۹۰ء ص ۴۹

۱۴۵۔بشیر بیدار، کریاب، مسقط، بلوچ ادبی مجلس ۱۹۹۹ء ص ۸۴

۱۴۶۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۶۹

۱۴۷۔اللہ بخش بزدار، ھشکیں رکھ سوزبت، کراچی (؟) ۱۹۸۸ء ص ۹۴

۱۴۸۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۵۵

۱۴۹۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۴۶

۱۵۰۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۸۴

۱۵۱۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۹۱

۱۵۲۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۱۰۰

۱۵۳۔رزاق نادر، قاضی ءِ شاعری، ماہنامہ بلوچی کوئٹہ ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۱۳

۱۵۴۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۱۱

۱۵۵۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۱۴

۱۵۶۔غوث بخش صابر، بلوچی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۹ء ص ۱۲۶

۱۵۷۔مبارک قاضی، زرنوشت، کراچی، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۹۰ء ص ۴۹

۱۵۸۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔ص ۵۳

۱۵۹۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔ص ۸۰

☆☆☆

کتابیات

1 آزات جمالدینی، رژن، کراچی، المخزن پرنٹرز ۱۹۹۵ء

2 ابراہیم عابد، شہم، تربت، کیچ پبلی کیشنز ۱۹۸۵ء

3 ابراہیم عابد، (مرتب) بانگواہ تربت، ملا فاضل اکیڈمی ۱۹۹۲ء

4 احتشام حسین سید، تنقیدی نظریات، لکھنو، ادارہ فروغ اردو ۱۹۶۱ء

5 احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید لکھنو، ادارہ فروغ اردو ۱۹۶۱ء

6 احتشام حسین، تنقیدی جائزے، الہ آباد، پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۱ء

7 احمد زہیر، رپتیں زہیر، کراچی، پاذل اکادمی ۱۹۷۰ء

8 احمد سلیم پروفیسر، ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی، لاہور، جنگ پبلشرز ۱۹۹۰ء

9 احمد، پروفیسر عزیز الدین، کیا ہم اکھٹے رہ سکتے ہیں، لاہور مکتبہ فکر و دانش ۱۹۸۸ء

10 اعظمی، خلیل الرحمٰن، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۷۹ء

11 اکبر بارکزئی، روچا کئے کشت کنت، کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی ۱۹۸۸ء

12 امرتا پریتم، ایک اداس کتاب، کراچی، ستعارہ پبلی کیشنز ۱۹۸۷ء

13 بزدار، اللہ بشک، ھشکیں رکھ سوز بنت، کراچی ۱۹۸۸ء

14 بشیر احمد، وگران ناز، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۰ء

15 بشیر بیدار، گور بام، تربت، پاک نیوز ایجنسی ۱۹۸۲ء

16 بشیر بیدار، ھزام، کراچی، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۹۰ء

17 بشیر بیدار، کریاب، مسقط، بلوچ ادبی مجلس ۱۹۹۹ء

18 بلوچ، غلام فاروق، نوکیں تام، کراچی، بلوچی لبزانک دیوان ۱۹۸۵ء

19 جعفری، ڈاکٹر سید حسنین محمد، احمد سلیم (مرتبین) پاکستانی معاشرہ اور ادب، کراچی پاکستان سٹڈی سنٹر جامع کراچی ۱۹۸۷ء

20 شیخ نور محمد (مرتب) میر گل خان نصیر شخصیت، شاعری اور سیاست، کراچی، عوامی ادبی انجمن ۱۹۸۸ء

21۔ شیما مجید، نعیم احسن، (مرتبین) ادب، فلسفہ اور وجودیت، لاہور، نگارشات میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ ۱۹۹۲ء

22 سید ہاشمی، انگروترونگل، کراچی ۱۹۶۲ء

23 سید ہاشمی، تراپکنیں ترمپ، کراچی، انٹرنیشنل پریس ۱۹۶۵ء

24 سید ہاشمی، سچکانیں سسا، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۵ء

25 سید ہاشمی، شکلیں شہجو، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۸ء

26 صابر، عبدالرزاق (ڈاکٹر)، بلوچی ادب، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ ۱۹۹۶ء

27 صابر، غوث بخش، بلوچی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۹ء

28 صبا دشتیاری، انگریں واہگ، کراچی، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری ۱۹۹۹ء

29 عسکری، محمد حسین، جھلکیاں، (حصہ اول) لاہور، مکتبہ الروایت
30 عطاشاد، روچ گر، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۶ء
31 عطاشاد، شپ سحار اندیم، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۶ء
32 کریم دشتی، شرگداری، کوئٹہ، زمانہ پرنٹنگ پریس ۱۹۶۳ء
33 مبارک قاضی، زرنوشت، کراچی، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۹۰ء
34 مراد ساحر، پاہار، کراچی، پاذل اکیڈمی ۱۹۷۰ء
35 مراد ساحر، چیہال، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۸۷ء
36 مراد ساحر، زرءِ مروارد، کوئٹہ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن ۱۹۹۵ء
37 مقبول، میاں ظفر (مرتب) کلام حضرت بلھے شاہؒ، لاہور، مکتبہ دانیال ۲۰۰۰ء
38 نصیر، میر گل خان، گلبانگ، (بار دوئم) کراچی، بلوچ کلچرل اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۸۹ء
39 نصیر، میر گل خان، شپ گردک، کراچی، بلوچی اکیڈمی ۱۹۶۴ء
40 نصیر، میر گل خان، گرند، مستونگ قلات پبلیشرز ۱۹۷۱ء
41 نصیر، میر گل خان، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، کوئٹہ بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۶ء
42 نصیر، میر گل خان، بلوچی زرمیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء
43 نصیر، میر گل خان، بلوچی عشقیہ شاعری، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۷۹ء
44 نصیر، میر گل خان، گلگال، کراچی، سید ہاشمی اکیڈمی ۱۹۹۳ء
45 نصیر، میر گل خان، شنبلاک، کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۱۹۹۴ء

46 واحد بزدار، قدیم بلوچی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اسلام آباد، قومی ادار
برائے مطالعہ پاکستان ۱۹۹۷ء
47 واحد بزدار، شاہیم کوئٹہ، بلوچی اکیڈمی ۹۹۸
48 یاسر، خالد اقبال (مرتب) ادبی جائزے، اسلام آباد، اکادمی
ادبیات پاکستان ۱۹۸۶

☆☆☆

جدید بلوچی شاعری سچائی، دیانت اور خونِ جگر کی
بدصورتی اور بدوضعی کے خلاف احتجاج، انکار اور مزاحمت
مرکزی موضوع ہے۔ اِس کے یہاں دائمی امن، عدل،
انسانی تقدیر اور اِس کے مستقبل کا سوال قومیتوں کے باہمی اخ
اشتراک، عالمی اجتماعیت، عالمی امن اور عالمی احساس
پنہاں ہے۔ اور یہی انسانی مستقبل کا حقائق نامہ بھی

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ